

# خانقہ کائنات

( حصہ اول )

بہنام مرزا مرتضیٰ حسین تیمبر

مطبوعہ سرائے قومی پریس و کٹا اٹھ لکھنؤ

# امامیہ کی تینالیسیویں دینی خدمت

## مسئلہ خلافت امامت

رسالہ نگار لکھنؤ میں جو ملک کے موقر اديب جناب نیاز فتحپوری کی ادارت میں نکلتا ہے مارچ ۱۹۵۵ء سے ایک سلسلہ تحقیقی مضامین کا جاری ہے جو مسئلہ خلافت و امامت کے متعلق ایک نادر ذخیرہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

ہم چاہتے ہیں کہ اس سلسلہ کی تمام متعلقہ کڑیوں کو ایک متحی نظام کے ساتھ دنیائے علم میں محفوظ کریں جس سے آئندہ نسلوں تک کو ایک منقطع نتیجہ تک پہنچنے میں آسانی ہو۔

بحالت موجودہ اس سلسلہ کا پہلا حصہ شایع ہو رہا ہے اور قریباً بھی انشاء اللہ غریب ہدیہ ناظرین کے جا سکیں گے۔ والسلام

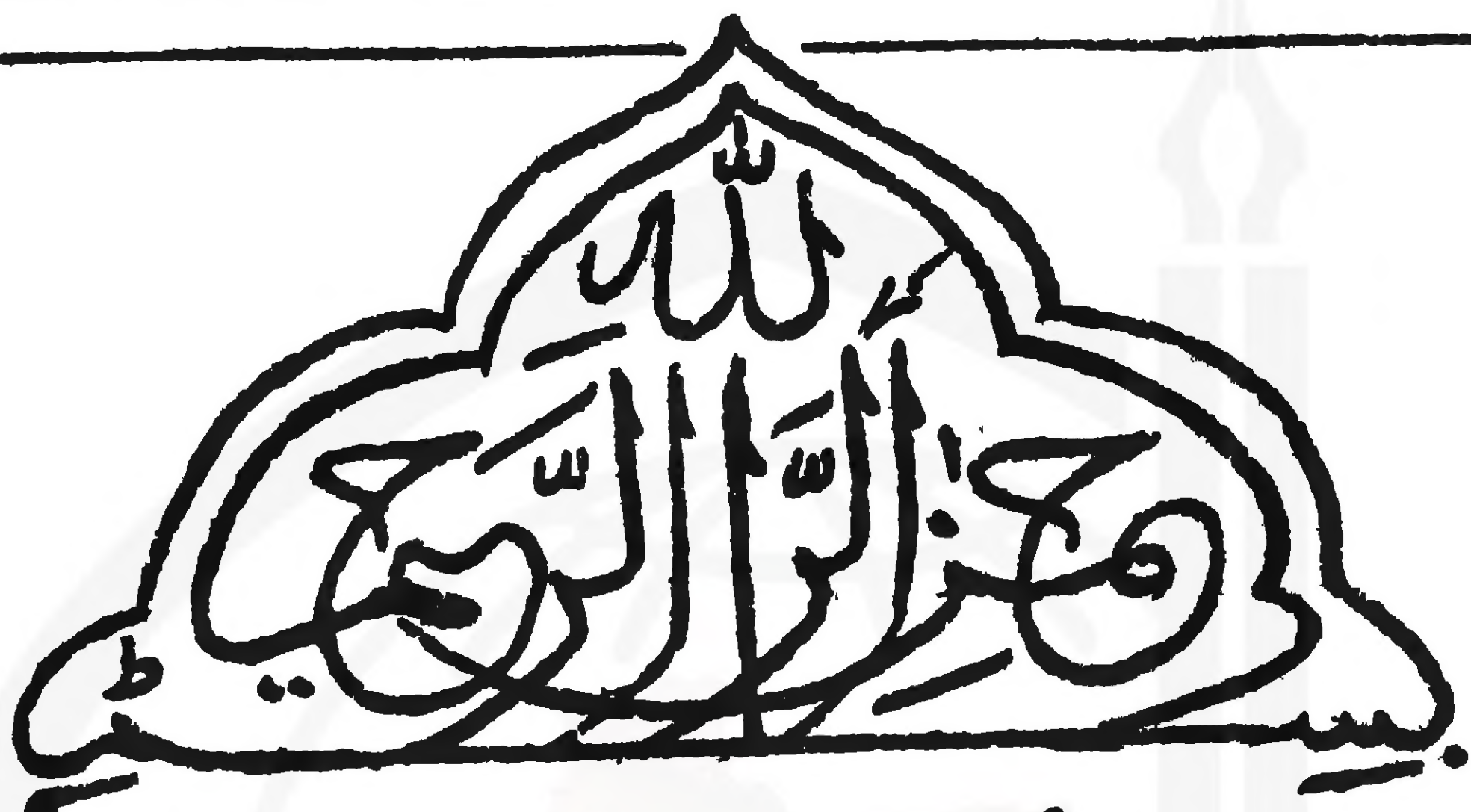
خادم مذہب

سید محمد رضا نقوی

سکرٹری امامیہ سن لکھنؤ

رجب ۱۳۵۵ھ





# فت مت مسئلہ خلا و اما

(۱)  
(ایک غیر مسلم کے نقطہ نظر سے)

”محترم مدیر نگار“ میں ایک عرصہ سے نگار کا مطالعہ کر رہا ہوں اور اس میں کلام نہیں کہ مذہب کے باب میں آپ کی بے لاگ تنقیدوں سے میں نے کافی استفادہ کیا، لیکن افسوس ہے کہ اس وقت تک آپ نے اسی مسئلہ پر توجہ نہیں کی جو یقیناً جماعت اسلامی کے ہر فرد کی اولین توجہ چاہتا ہے۔

مجھے شیونہ کسی جماعت سے تعلق نہیں ہے، کیونکہ میں ایک غیر مسلم شخص ہوں، لیکن میں ہمیشہ جماعت اسلامی کے ان دونوں فریقوں کے اختلاف کو نہایت فساد کے ساتھ دیکھا ہے اور حیران ہوں کہ اس وقت تک کیوں اس تفریق کے مٹانے کی کوشش نہیں کی گئی۔

مکن ہر آچے مسئلہ خلافت و امامت پر صرف اسلئے اظہار خیال نہ کیا ہو کہ یہ  
نزاع عرصہ چلی آرہی ہو اور اس کا فیصلہ شوارہ ہے لیکن یہ ضرور نہیں کہ ماضی کا  
عقدہ لایحل مستقبل حال میں بھی بہتور مقرر بنا رہا ہو، بہر حال میں عرصہ متمنی تھا کہ  
آچے خیالات اسباب میں معلوم کردوں اور اس کی تدبیر میں نے یہی مناسب سمجھا کہ خود  
اپنی تحقیق اس مسئلہ میں آچے سامنے پیش کردوں اور اگر آپ کو اس سے اختلاف یا  
اتفاق ہو تو "باب لمراسلۃ والمناظرہ" کے وساطت سے جو غالباً اسی غرض کے ساتھ  
جگہ میں قائم کیا گیا ہے آپ مجھے جواب دیکھیں۔

آپ دیکھیں گے کہ میں نے اس مقالہ کی طیارہ میں تاریخ اسلامی کے اصل مآخذ کو  
سامنے رکھا ہے اور اس لئے مجھے اُمید ہے کہ جواب دینے میں آپ بھی اس کا التزام  
رکھیں گے۔ "ہر نام"

نفسہ کے کیسے کیسے عمیق مسائل ط ہو گئے، ریاضی کے کیسے کیسے دقیق نظریات  
حل ہو گئے، نظام طبایع و سی کی جگہ نظام فیتا وغیر نے ییل، نیوٹن کے نظریہ کشش کو  
انیشٹین نے بدل کر رکھ دیا، لیکن خلافت کا جھگڑا مسلمانوں میں ساڑھے تیرہ سو  
بیس گزرنے کے بعد بھی اسی طرح الجھا ہوا پڑا ہے۔

"خلافت" عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی "جانشینی" یا قائم مقامی  
کے ہیں لیکن "جانشینی" کا مفہوم صرف جگہ پر بیٹھ جانا نہیں ہے، بلکہ جانشینی



بحیثیت عہدہ، بحیثیت منصب، بحیثیت ذوالنفس، بحیثیت اخلاق و اعمال اور بحیثیت مراتب و کمال ہوا کرتی ہے۔

ایک شاعر کا جانشین شاعر، طبیب کا جانشین طبیب، قاضی کا جانشین قاضی، اور وکیل کا جانشین وکیل ہوا کرتا ہے۔ ایک شاعر کی جگہ حکیم اور حکیم کی جگہ قاضی اور قاضی کی جگہ وکیل سے پر نہیں ہو سکتی، بلکہ ایک ہی نوع میں صنف کے بدلنے سے بھی خصوصیت مختلف ہو جاتی ہے، یعنی خود شعرا میں مرثیہ گو کا جانشین غزل گو اور غزل گو کا جانشین قصیدہ گو نہیں سمجھا جاسکتا۔ چہ جائیکہ شاعر کی جگہ دوبارہ اور قاضی کی جگہ معمار صحیح جانشین سمجھا جائے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ "خلیفہ" حقیقتاً وہ ہے جو اپنے کمالات و خصوصیات میں اپنے پیشرو کے کمالات و خصوصیات کا زیادہ سے زیادہ شریک حصہ دار ہو۔ اس نظریہ کے ماتحت ہمارے سامنے قدرتا یہ تنقیح پیش ہوتی ہے کہ حکمران کی حیثیت ایک دنیاوی بادشاہ کی سی تھی یا ایک معلم روحانی کی۔ یعنی آپ کا مقصود صرف حکومت و سلطنت قائم کرنا تھا یا لوگوں کے اخلاق کو درست کرنا ظاہر ہے کہ آپ کسی سلطنت کی بنیاد نہیں رکھ رہے تھے بلکہ ایک قوم بنا رہے تھے جو انسانیت و اخلاق کے جوہر سے آراستہ ہو اور بجائے تیغ و خنجر کے اپنی شرافت نفس سے روحانی حکومت دنیا میں قائم کرے۔

اگر آپ کی حیثیت صرف ایک دنیاوی بادشاہ کی سی ہوتی تو بیشک آپ کی



خلافت کے لئے ایک بادشاہ ہونے کی حیثیت کافی تھی اور جو کوئی آپ کا خلیفہ مقرر کر دیا جاتا کسی کو اعتراض کا حق حاصل نہ تھا، لیکن اگر رسولؐ کی حیثیت صرف ایک بادشاہ کی سی نہ تھی بلکہ معلم و حانی ہونے کی خصوصیت بھی آپ میں پائی جاتی تھی تو ہم کو دیکھنا چاہیے کہ اس باب میں فضیلت کس کو حاصل تھی۔ اب آئیے واقعات تاریخی پر ایک نگاہ ڈال کر دیکھیں کہ ان کا فیصلہ اس مسئلہ میں کیا ہے۔

سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ اسلام قبول کرنے کی حیثیت سے کس کس پر تفوق حاصل ہے۔ ظاہر ہے کہ منصب نبوت ملنے کے بعد آنحضرتؐ نے اول اول اپنے ہی گھروالوں سے تبلیغ کی ابتدا کی ہوگی جن میں جناب خدیجہ اور علیؑ کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ اور۔ اگر اہل سنت کی مستند کتابوں پر اعتماد کیا جائے تو فیصلہ دشوار نہیں کہ سب سے پہلے جن انسان ہستی نے قبول کیا وہ جناب میر کی ذات تھی۔ شیخ الاسلام حافظ ابن حجر عسقلانی، تقریب التہذیب میں لکھتے ہیں:

المروج انہ اول من اسلم۔

یعنی ترجیح اسی امر کو ہے کہ سب سے پہلے آپؐ اسلام لائے۔ اسی کتاب کے باب الاتفاق سے پتہ چلتا ہے کہ آپؐ کا سابق الاسلام ہونا اتنا مشہور تھا کہ آپ کا خطاب ہی "سابق العرب" (اول عرب میں سب سے پہلے اسلام لانے والا) قرار



پایا تھا۔

واقعات سے بھی اس قول کی ترجیح ظاہر ہوتی ہے۔ عصفیہ کنڈی کی روایت ملاحظہ ہو:۔

”میں تاجو تھا، حج کے لئے مکہ آیا تو عباس ابن عبد المطلب کی ملاقات کو جایا کرتا تھا، ایک دن ان کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ میں نے دیکھا ایک شخص پردہ سے نکلا اور پھر عبادت میں مصروف ہو گیا۔ اس کے بعد ایک خاتون پردہ سے باہر آئی اور اس شخص کے پیچھے کھڑی ہو گئی، میں نے عباس سے پوچھا یہ کون ہیں! انھوں نے کہا کہ یہ محمد ابن عبد شمس ہیں۔ میں نے پوچھا وہ خاتون کون ہیں کہا ان کی بڑی خدیجہ بنت خویلد۔ تھوڑی دیر میں ایک کسینہ نے عمر صاحبزادہ آیا اور وہ بھی لکے ساتھ مصروف عبادت ہو گیا۔ میں نے پوچھا یہ کون ہیں؟۔ عباس نے کہا کہ یہ محمد کا چچا زاد بھائی سعلی ہے۔ میں نے کہا یہ کرتے کیا ہیں۔ جواب ملا کہ نماز پڑھتے ہیں۔ محمد کا خیال ہے کہ خدانے ان کو پیغمبر بنایا ہے اور اس وقت سوائے انکی بیوی اور چچا زاد بھائی کے کسی نے ان کے اس دعوے کو تسلیم نہیں کیا۔ اس کے باوجود محمد کا خیال ہے کہ وہ قبصر و کسریٰ کے مالک کو فتح کریں گے۔“

عصفیہ اس واقعہ کے بعد اسلام لائے تھے اور کہا کرتے تھے کہ ”لو حان سر زقنی الاسلام یومئذ کنت ثانیا مع علی بن ابی طالب یعنی اگر سر زقنی



مجھے اسلام لانے کی توفیق ہو جاتی تو علیؑ کے بعد دوسرا میں ہوتا۔  
 اس روایت کو علامہ ابن عبدالبر قرطبی نے استیعابؑ میں، ابن اثیر  
 جزیری نے اسد الغابہؑ میں، ابن جریر طبری نے تاریخ کبیرؑ میں اور ابن اثیر  
 نے کاملؑ میں درج کیا ہے۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب آنحضرتؐ مخفی طور پر تبلیغ اسلام کر رہے تھے  
 لیکن جب آیت ”واذکر عشیرتنا الاقربین“ نازل ہوئی اور  
 ایک محدود دائرہ کے اندر تبلیغ کا حکم نازل ہوا تو آنحضرتؐ نے اپنے اقربا و اولاد  
 و غلبہ لمطلب ہاشم کو جمع کیا اور اس وقت جو تقریر آپؐ کی وہ خلافت  
 کے مسئلہ کو بھی ہمیشہ کے لئے حل کر گئی۔ ارشاد ہوتا ہے:-

<p>اے فرزندان عبدالمطلب! اور کرو          کہ میں نہیں سمجھتا عرب کے کسی جوان نے          اپنی قوم کے سامنے وہ تحفہ پیش کیا          جو میں تمھارے سامنے پیش          کرتا ہوں۔ میں دنیا اور آخرت کی          بہتری کا تحفہ پیش کرتا ہوں اور</p>	<p>یا بنی عبدالمطلب! واللہ          ما اعلم شابا فی العرب جاء          قومه با فضل عما قد جئتم          انی قد جئکم بخیر الدینا          والاخرة وقد امرنی اللہ تعالیٰ          ان ادعوکم الیہ فناء یکم</p>
---	---

۱۔ مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن جلد ۲ صفحہ ۲۲۵ ۲۔ مطبوعہ مصر جلد ۳

صفحہ ۲۱۴ ۳۔ مطبوعہ مصر جلد ۲ صفحہ ۲۱۲ ۴۔ جلد ۲ صفحہ ۲۰۔



اِوَا نَزَرْنِي عَلٰی هٰذَا لَا مَرَعٰلِي  
اَنْ يَكُوْنَ اَخِي ، وَوَصِيِي وَ  
خَلِيْفَتِي فَيَكْم -

خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تم کو اس کی  
دعوت دوں۔ پھر کون ہے جو اس  
امر میں میرا ساتھ دے تاکہ وہی میرا  
سبائی میز ولی عہد اور میرا جانشین قرار پائے۔

پس کرم جمع پر خاموشی کا عالم طاری ہو گیا اور کسی طرف سے کوئی آواز بلند  
نہ ہوئی۔ آخر کار علیؑ اٹھے اور بآواز بلند کہا کہ ”انا یا نبی اللہ ان اکون  
وزیرک علیہ“ رے رسولؐ! میں آپ کی اعانت و ہمدردی کیلئے  
آمادہ ہوں۔ حضرتؑ نے یہ شکر فرمایا ”ان ہذا اخی ووصیی و  
خلیفتی فیکم فاسمعوا لہ واطیعوا“ (دیکھو یہی میرا سبائی میز ولی عہد  
اور میرا جانشین ہے۔ تم سب کو اس کی بات سننا اور اس کی اطاعت کرنا چاہیے  
چلئے معاہدہ ہو گیا، قرار داد پائیہ تکمیل کو پہونچائی، علیؑ نے بیعت کی،  
رسولؐ نے بیعت لی، کس بات پر؟ نصرت اسلام پر اعلیٰ کلمۃ الحق پر اور  
رسولؐ نے اسی وقت اپنی خلافت و جانشینی کا مسئلہ بھی طے کر دیا۔

بیشک اگر خود علیؑ اس کے بعد اپنے فرائض میں کوتاہی کرتے اپنے قرار و

سلسلہ تاریخ نبیر طبری جلد ۲ صفحہ ۲۱۰۔ ابوالفداء مطبوعہ مصر جلد ۱ صفحہ ۱۱۶۔ کامل

ابن اثیر جلد ۲ صفحہ ۲۲ لباب التاویل خازن بغدادی مطبوعہ مصر جلد ۵ صفحہ ۱۰۶

معالم التنزیل بر حاشیہ تفسیر خازن مطبوعہ مصر جلد ۵ صفحہ ۱۰۵۔



میں ثابت قدم نہ ٹھہرتے، اپنے عہد نصرت میں کمزور ثابت ہوتے، تو یہ معاہدہ بھی کالعدم ہو جاتا، لیکن چونکہ آپ کی خدمات شروع سے اخیر تک یکساں طور پر اسی طرح قائم رہتی ہیں اس لئے ہم کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ وہ معاہدہ منسوخ ہو گیا۔

اب آئیے اس کی تحقیق بھی کر لیں کہ آپ نے کسی وقت کوئی کمزوری تو نہیں دکھائی، اعانت رسول سے کبھی منہ تو نہیں پھیرا اور جو قول و قرار ایک بار ہو چکا تھا اس سے کبھی انحراف تو نہیں کیا۔

یہ امتیاز مسیح اسلام کے دیکھنے والوں سے مخفی نہیں کہ جب رسول اللہ نے تبلیغ شروع کی تو کفار کی ایذا رسا نیاں بڑھنے لگیں، آپ کے قتل کی تیاریاں ہونے لگیں اور مسلمانوں کی جماعت ہجرت پر آمادہ ہو گئی۔ چنانچہ حدیبیہ کے قبائل عرب میں سے چند لوگ اس بات پر تیل گئے کہ گھر کا محاصرہ کر کے آپ کو قتل کر ڈالیں۔ ظاہر ہے کہ یہ وقت کتنا نازک تھا! اور ایسے وقت میں مدد دینے والا کوئی نہیں ہوتا لیکن رسول اللہ جانتے تھے کہ کون کام آنیوالا ہے اس لئے آپ نے بلا تامل مکہ سے پوشیدہ طور پر ہجرت کا ارادہ کر لیا اور کفار کے عزائم کو ناکام بنانے کے لئے آپ نے جناب امیر سے یہ خیال ظاہر کر کے کہا کہ۔

ثم علی فراشی واتشح ببردی لحضرہ الاخضر فتم فیہ



رتم میرے بچوں نے پر سور ہوا اور میری سبز کھادر اوڑھ کر لیٹ جاؤ (کتنی سخت مرحلہ تھا کبیشی شوار گزار منزل تھی، مگر وہ جو ایک بار جان نثاری و وفاداری کا عہد و پیمان کر چکا تھا، اپنی جان دینے کے لئے چادر تان کر سور ہا اور رسالت کتاب تشریف لے گئے۔  
قسطلانی نے کہا ہے۔

”فکان اول من شری نفسه“ (وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے

اپنی جان بیچ ڈالی)

امام غزالی لکھتے ہیں کہ اس موقع کے لئے علیؑ کی باب میں یہ آیت نازل ہوئی۔  
”ومن الناس من یشری نفسه ابتغاء مرضات اللہ“ (ایسے

بھی لوگ ہیں جو خدا کی مرضی پر اپنی جان بیچ ڈالتے ہیں۔)  
اکثر مورخین نے ظاہر کیا ہے کہ رسالت کتاب اپنے بعد علیؑ کو اس لئے چھوڑ گئے تھے کہ وہ لوگوں کی امانتیں جو رسول اللہ کے پاس تھیں واپس کر دیں۔  
۳۔ حضرت کی معیت میں حضرت ابو بکر تشریف لے گئے اور غار میں پناہ لی، جب کفار قریش تعاقب میں یہاں تک پہنچ گئے تو حضرت ابو بکر کو نکر

۱۔ مواہب لدنیہ جلد ۱ صفحہ ۸۔ ۲۔ تاریخ خمیس جلد ۱ صفحہ ۳۶۔ ۳۔

ابوالفراء جلد ۱ صفحہ ۱۲۶۔ تاریخ خمیس دیار بکری جلد ۱ صفحہ ۳۶۶۔ کامل بن شہیر

جلد ۲ صفحہ ۳۹۔ مواہب لدنیہ قسطلانی مطبوعہ قسطنطنیہ جلد ۱ صفحہ ۹۰۔

دہم تکبیر ہوئی، آنحضرت نے فرمایا، رنج نہ کرو خدا ہمارے ساتھ ہے۔ قرآن کی آیت یہ ہے۔

ثانی اشہد انہما فی الغار اخ  
بقول لصاحبہ لا تحزن ان  
اللہ معنا ، فانزال اللہ السکینۃ  
علی رسولہ ﷺ

تو خدا نے اطمینان و سکون نازل کیا اپنے رسولؐ پر۔

اس واقعہ پر حضرت ابو بکر کے فضائل بیان کئے جاتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ نے  
 صاحب کے لفظ سے یاد کیا اور آنحضرت نے (ان اللہ معنا) کہہ کر اپنے ساتھ  
 ان کو بھی شامل کر لیا لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک شخص کو محض لفظ  
 صاحب یا ساتھی سے یاد کرنا جبکہ وہ واقعی ساتھ ہو کس فضیلت کو ثابت  
 کرتا ہے، لفظ (صاحب) تو ایسا ہے جس میں ہر شخص شامل ہو سکتا ہے، چنانچہ  
 قرآن میں دوسری جگہ کسی مومن وغیر مومن کی گفتگو کے سلسلہ میں لفظ (صاحب)  
 اسی طرح نظر آتا ہے۔ ملاحظہ ہو:-

اذ قال لصاحبه وهو يحاوره اكفرت بالذى خلقك  
 الغریب كى ما قس كوسا نھى كذا كنى ايسى بات نهى جس سے كوفى فضيلت  
 ظاہر ہو۔۔۔ با خدا كا سا تقدیر ہوتا، سو ظاہر ہے کہ جس جگہ رسولؐ ہوں گے وہاں



خدا کی معیت بھی ہوگی۔

غار والی آیت میں سب سے زیادہ قابل غور آخری الفاظ ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے صرف اپنے نبی پر اطمینان و سکون نازل کیا۔ یہاں ان کے ساتھی کا ذکر بالکل نہیں ہے۔ اگر خباب ابو بکر کے اطمینان و سکون کو کبھی ظاہر کرتا مقصود ہوتا تو اعلیٰ رسول کے بجائے (علیہما) ارشاد ہوتا۔

ہر حال اس واقعہ ہجرت و واقعہ غار میں حضرت علیؑ نے جس تیار و قربانی جس دلیری و بے نفسی کا ثبوت دیا وہ بجائے خود اتنا اہم ہے کہ حضرت ابو بکر کی معیت وغیرہ کا کوئی سوال اس کے مقابلہ میں لایا ہی نہیں جاسکتا۔ اب اور آگے چلئے۔

مدینہ میں آنے کے بعد آنحضرتؐ نے ہاجرین و انصار کے درمیان دوبارہ مواخاۃ قائم کی۔ ظاہر ہے کہ بھائی چارہ انھیں دو آدمیوں میں قائم کیا جاتا ہے جو اپنی خصوصیات مزاجی و عادات و خصائل کے لحاظ سے باہم گہر بہت ملتے جلتے ہوں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں حضرت ابو بکر کو حضرت عمر کے ساتھ بھائی بھائی قرار دیا، حضرت حمزہ کو زید ابن حارثہ کے ساتھ، حضرت عثمان کو عبدالرحمن ابن عوف کے ساتھ، زبیر کو ابن مسعود کے ساتھ، عبیدہ ابن حارث کو بلال کے ساتھ، مصعب بن عمیر کو سعد ابن ابی وقاص کے ساتھ، ابو عبیدہ جراح کو سالم بن ابی حذیفہ کے ساتھ اور سعید ابن زید کو طلحہ کے ساتھ۔ رہ گئے علیؑ و ان کا

بھائی چارہ اپنے ساتھ کیا۔ چنانچہ مورخ ابوالفدا لکھتا ہے :-  
 اخي رسول الله فاتخذ رسول  
 الله علي ابن ابي طالب خاواكان  
 علي يقول علي منبر الكوفة  
 ايام خلافة انا عبد الله  
 واخو رسول الله -

آنحضرت نے اپنے صحاب میں اخا  
 قرار دی اور علی ابن ابی طالب کو اپنا  
 بھائی قرار دیا اور علی اپنے زمانہ خلافت  
 میں کوفہ کے منبر پر کھاکرتے تھے کہ  
 میں خدا کا بندہ اور رسول خدا کا  
 بھائی ہوں -

ایک دوسرے موقع پر بھی رسول اللہ نے سب کو ایک دوسرے کے ساتھ  
 بھائی بنایا تھا اور علیؑ کو اپنے ساتھ رکھا تھا۔ ابن عبدالبر نے استیعاب  
 میں لکھا ہے :-

اخي رسول الله بين المهاجرين  
 ثم اخي بين المهاجرين  
 ولا نصار وقال في عل  
 واحد منهما لعل انت اخي  
 في الدنيا والاخرة -

رسول اللہ نے ایک بار ہاجرین کے  
 درمیان مواخاة قائم کی اور دوسرے  
 بار ہاجرین و انصار کے درمیان اور  
 ہر مرتبہ یہی فرمایا کہ علیؑ دنیا و آخرت  
 میں میرا بھائی ہے -

۱۵ تاریخ ابوالفدا جلد ۱ صفحہ ۱۲۷

۱۶ مطبوعہ دائرة المعارف حیدرآباد جلد ۲ صفحہ ۲۷۳ -

اس کا تذکرہ ابن حجر مکی کی صواعق محرقة از تاریخ خمیس میں بھی موجود ہے۔



مسجد نبوی کی صورت یہ تھی کہ اس کے چاروں طرف صحابہ کے گھر تھے اور ان سب کے دروازے مسجد میں کھلتے تھے جس سے لوگوں کی آمد و رفت صحیح مسجد میں رہتی تھی۔ ایک مرتبہ آنحضرت نے حکم دیا کہ سب دروازے چن دے جائیں مگر علیؑ کے مکان کا دروازہ نہ چنایا جائے اس حکم پر لوگوں میں جھگڑیاں ہوئیں تو حضرت نے منبر پر جا کر فرمایا کہ ”مجھے جو حکم خدا کی طرف سے ہوا وہ میں نے کیا۔ میں نے اپنی مرضی سے نہ ان دروازوں کو بند کیا نہ اس کو کھلا رکھا۔“

اس واقعہ سے اور اس قسم کے بہت سے نظائر سے جن کا ذکر آگے آئے گا معلوم ہوتا ہے کہ لوگ رسول کی ان توجہات کو جو جناب علیؑ کے ساتھ تھیں۔ اچھی نگاہوں سے نہ دیکھتے تھے اور جناب رسالتؐ کی موجودگی میں بھی نکتہ چینی سے باز نہ آتے تھے، اور یہ وہ جذبات تھے جن کا آہستہ آہستہ قوی ہونا ضروری تھا کیونکہ رسول اللہؐ کے الطاف جناب میر پر برابر بڑھتے ہی جاتے تھے اور جبکہ آئندہ صفحات سے معلوم ہوگا حضرت علیؑ اپنی خصوصیات اخلاق کی وجہ سے رسول اللہؐ کے دل میں گھر کرتے ہی جا رہے تھے۔

۱۔ مطبوعہ مصر صفحہ ۵۷، ۵۸ جلد ۱ صفحہ ۲۹۸۔

۳۔ خصائص نساوی صفحہ ۳۷۔ ریاض نضر جلد ۲ صفحہ ۱۹۲۔



۲۰ھ میں اسلام کی سب سے پہلی لڑائی ہوتی جس کا نام جنگ بدر ہے ،  
مسلمانوں کی تعداد کم تھی ، ساز و سامان بھی موجود نہ تھا اور رسول اللہ کے  
لئے میدان جنگ سے کچھ علیحدہ ایک عرش بنا دیا گیا تھا تاکہ وہاں سے جنگ  
کی حالت کا مشاہدہ فرماتے رہیں ۔

حضرت ابو بکر نے اس لڑائی میں کوئی عملی حصہ نہیں لیا بلکہ وہیں عرش  
پر بیٹھے رہے حضرت عثمان اپنی بیوی کی علالت کی وجہ سے مدینہ ہی میں  
رہ گئے تھے ۔ میدان جنگ اُس دن چند آدمیوں کے ہاتھ رہا جن میں نمایاں  
حصہ رسول اللہ کے قراستداروں نے لیا ۔ مثلاً حضرت حمزہ ابن عبد المطلب ،  
عبیدہ بن حارث اور حضرت علی ۔ عبیدہ شہید ہو گئے اور حضرت علی کے ہاتھ  
سے بڑے بڑے کفار قتل ہوئے ۔

اسی سال حضرت نے علی ابن ابی طالب کو اپنی دامادی سے سرفراز کیا اور  
اپنی محبوبہ جبرادی حضرت فاطمہ زہرا کا عقد اُن سے کر دیا ۔ تاریخوں کے  
مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابو بکر اور حضرت عمر دونوں نے خواستگاری  
کی مگر رسول اللہ نے کوئی جواب نہ دیا ۔ لیکن جب حضرت علیؑ نے خواہش ظاہر کی  
۱۔ طبری جلد ۲ صفحہ ۲۸۰ ۔ ابوالفداء جلد ۱ صفحہ ۱۲۸ تاریخ خمیس جلد ۱ صفحہ ۲۲۷ طبقاً  
ابو سعد جلد ۱ صفحہ ۲۹۰ طبری جلد ۳ صفحہ ۲۹۲ ۔ ابوالفداء جلد ۱ صفحہ ۱۲۹ تاریخ خمیس جلد ۱ صفحہ ۲۱۸  
طبقات ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۳۶۲ تاریخ ابوالفداء جلد ۱ صفحہ ۱۲۹ ۵ صواعق محرقة مطبوعہ مصر صفحہ ۸۶  
تاریخ خمیس جلد ۱ صفحہ ۴۰ ۔ موابہب لدنیہ جلد ۱ صفحہ ۸۹ ۔

تو حضرت فرمایا کہ :-

قد امر فی ربی بذلک را سکا تو مجھے خدا نے حکم دیا ہے ۔  
جب عقد ہو چکا تو حضرت نے جناب فاطمہ سے فرمایا ۔

<p>اما ترضین یا فاطمة ان الله اختار من اهل الارض رجلا يجعل جدكما ابا له والاخر بعلا له</p>	<p>اے فاطمہ کیا تم اس بات سے خوش نہیں ہو کہ خدا نے تمام اہل زمین میں دو شخصوں کا انتخاب کیا جن میں سے ایک تمہارا باپ ہے اور دوسرا شوہر ۔</p>
--	--

اس سے ظاہر ہے کہ اس شادی کی بنیاد صرف ذاتی قرابت پر نہیں تھی  
بلکہ انتخاب اکہی اور فضیلت ذاتی پر تھی مصباح اسلامی کے لحاظ سے لڑکیا  
لے لینا اور خود ا مادین جانا دوسری بات تھی ، لیکن جب لڑکی دیئے کا وقت  
آیا تو بڑے بڑے صحابہ کی خواہشیں رد کر دی گئی اور حضرت علی کا انتخاب کیا گیا  
یہ واقعہ ایسا نہ تھا جس کا اثر زایل ہو جاتا ، رہا اور عمر بھر رہا ، چنانچہ حضرت  
عمر فرماتے تھے ۔

<p>لقد اعطی علی ثلاث خصال لان تکون لی خصلة منها احبالی من حمرا لنعم</p>	<p>علی کو تین باتیں ایسی حاصل ہوئیں کہ اگر ان میں سے ایک بھی مجھے حاصل ہوتی تو سرخ اونٹوں سے زیادہ مجھے محبوب</p>
---	---



فصل ماہی قال تزوج

ابنتہ ۱۵

ہوتی۔ پوچھا گیا وہ کیا ہیں۔ کہا کہ  
ایک تو یہی ہے کہ رسولؐ کی صاحبزادی  
کا عقد ان سے ہوا۔

۳۰۳ء میں اُحد کی جنگ ہوئی، یہ وہ سخت و فیصلہ کن جنگ تھی جسے  
قدرت کو مسلمانوں کے عزم و ثبات کی کسوٹی بنانا منظور تھا۔ اول اول حالاً  
بہت اُسید افزا تھے، کمونکہ لشکر کفار کے علمدار طلحہ بن عثمان کو حضرت علی  
نے قتل کر کے دشمنوں کو شکست دیدی لیکن جب کفار بھاگ کھڑے ہوئے  
اور مسلمان مال غنیمت لوٹنے کے لئے پس و پیش سے بے خبر ہو گئے تو خالد بن  
ولید نے (جو اس وقت تک اسلام نہ لائے تھے) پشت کی طرف سے پھر حملہ  
کر دیا اور اس کا نتیجہ جو کچھ ہوا اسے شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی زبان  
سے سن لیجئے راجح النبوة میں لکھتے ہیں کہ :-

”مسلمانانِ رومیہ ہر میت آوردند و حضرت رسولؐ راتہا گذاشتند، حضرت  
در غضب آمد و عرق از پیشانی ہا پوش تقاطر گشت، در اں حالت نظر کرد  
علی ابن ابی طالب را کہ رہیلوئے مبارکش ایستادہ است فرمود کہ تو چرا ایستادہ  
خود حق نہ گشتی یعنی فرار نہ کردی علی گفت اکفر بعد الا یمان ان لی بک

۱۵ صواعق محرقة صفحہ ۸۷ - تاریخ الخلفاء سید طوسی صفحہ ۱۷۱ -

اسوۃ یعنی آیا کافر شوم بعد از ایمان۔ بہ تحقیق کہ مرا بتواقتماست بایمان  
مفروضہ سرکار باشد۔ دریں اثنا جمعے از کفار متوجہ آنحضرت شدند۔  
آنحضرت فرمودے علیؑ، مرا زیں جمع نگہدار، و حق خدمت بجا آ کہ وقت  
نصرت ست۔ پس علیؑ متوجہ آن قوم شد۔ چنان قلع قمع نمود کہ جمعے  
کثیر بہ دوزخ افتادند و باقی ماندگان متفرق گشتند۔ می گویند کہ در  
روز شانزدہ زخمہا بہ تن مبارک خالہا پیر رسید۔

دل تھراتا ہے، قلم لڑتا ہے۔ جی چاہتا ہے موزوں کے منہ پر ہاتھ  
رکھوں، تاریخ کے صفحات سے ان حروف کو چیل کر پھینکیدوں۔ کس طرح  
دیکھوں اور کیونکر لکھوں کہ کس کس نے قرار کیا۔ لیکن حاکم کو کیا کروں، امام  
فخر الدین رازی، محمد ابن جریر طبری، ابن اثیر جزیری، شیخ الاسلام سیوطی۔  
ان سب کے بیانات کو کہاں لے جاؤں۔ جدھر دیکھئے اُس طرف سے "روایت بہت  
آوردند رسول اللہؐ اتہا گذاشتند" کی آواز آ رہی ہے اور لطف یہ کہ ایک  
ایک کا نام بھی لکھ دیا ہے۔

تاریخ خمیس (جلد ۱ صفحہ ۴۸۵) میں ہے کہ حضرت ابو بکر فرماتے ہیں۔  
لما صرف الناس یوم اُحد عن رسول اللہ کنت اول من  
جاء النبیؐ۔

(یعنی) جب لوگوں نے اُحد کے دن رسولؐ شری سے روگردانی کی تو میں



رسالت کا بکے پاس سب سے پہلے والیں آیا ۔

تفسیر جامع البیان ابن جریر طبری (جلد ۴ صفحہ ۹۶) میں لکھا ہے :-

قال عمر لما كان يوم احد هزمتنا ففررت حتى صعدت

الجبل فلقد رأيتني انزوكاني اروي "

یعنی حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ جب احد کے دن لوگوں نے شکست کھائی

تو میں بھاگ کر پہاڑ پر چڑھ گیا وغیرہ وغیرہ "

امام فخر الدین رازی تفسیر کبیر (جلد ۳ صفحہ ۴۲) میں لکھتے ہیں :-

ومن المنهزمين عمر الا انه لم يكن في اول المنهزمين

ولم يبعد بل ثبت على الجبل الى ان صعد النبي ومنهم ايضا

عثمان انهزم مع رجدين يقال لهما سعد وعقبة انهزما حتى

بلغوا موضعا بعيدا ثم رجعا بعد ثلثة ايام فقال لهم النبي

لقد ذهبتُم فيها عريضة -

افراہوں میں حضرت عمرؓ بھی تھے مگر وہ سب سے پہلے فرار کرنے والوں میں

نہ تھے اور بہت دور بھی نہ گئے تھے بلکہ پہاڑ پر چلے گئے تھے۔ افراہوں میں

سے حضرت عثمانؓ بھی تھے اور سعد و عقبہ کے ساتھ فرار کیا تھا اور یہ لوگ

بہت دور نکل گئے تھے اور جب تین دن کے بعد واپس آئے تو رسول اللہؐ

نے فرمایا کہ تم لوگ بہت لمبے نکل گئے تھے )

حضرت عثمان مقام انھوں کے حدود تک پہنچ گئے تھے اور جب ہاں  
تین دن کے بعد واپس آئے تو رسول سر نے وہ فقرہ فرمایا جس کا ذکر اوپر کیا ہے  
خود قرآن مجید میں جو تصویر اس جنگ کی پیش کی گئی ہے وہ بھی ملاحظہ ہو  
ارشاد ہوتا ہے :-

<p>وہ وقت جب تم ہمارے پرچمے چلے جا رہے تھے اور مڑ کے بھی کسی کو نہ دیکھتے تھے اور رسول تمہیں پیچھے سے آواز دے رہا تھا۔</p>	<p>اذ تصعدون ولا تلون علی احد والرسول یدعوکم فی اخر اکم۔</p>
--	--

یہ تھا وہ عبرت انگیز سماں اور یہ تھا وہ امتحان محبت و صداقت جس میں  
سوائے ایک ذات علیؑ کے اور کوئی دوسرا کامیاب ثابت نہ ہوا۔  
رسولؐ شکر اس دشمن طرز عمل کی وجہ سے اتنی بے اطمینانی پیدا ہو گئی تھی  
کہ آپؐ نے خاتمہ جنگ پر قتل ہو جانوالوں کے متعلق فرمایا :- ”ہو کلاء اشد  
علیہم یہ وہ ہیں جو کہ ایمان کی گواہی میں دیتا ہوں“۔

حضرت ابو بکرؓ نے کہا :- ”یا رسول اللہؐ کیا ہم انکے بھائی نہیں ہیں اور کیا ہم  
اسلام نہیں لائے اور کیا ہم نے کبھی آپؐ کے ساتھ جہاد نہیں کیا؟“  
حضرت نے فرمایا :- ”بلی ولا ادری ما تجد ثون بعدی“ (ہاں،



مگر کیا معلوم میرے بعد تم لوگ کیا کر گئے؟

۳۔ میں جنگ خندق واقع ہوئی۔ اُحد کے واقعہ کا دھباد امنوں پر  
موجود تھا اور اسکے چھڑانے کا یہ موقع اچھا تھا لیکن عمر ابن عبدود کا سا بہادری  
پورے جوش و خروش سے مبارز طلبی کر رہا تھا، کس میں ہمت تھی کہ موت کے  
منہ میں چلا جائے۔ تاریخ کا بیان ہے کہ: طلب المبارزۃ والا صحابہ  
ساکنون کا نما علی رؤوسہم الطیر لافھم کا نوا یعلمون شیئا  
اُس نے مقابل طلب کیا اور صحابہ تمام خاموش تھے گو یا کہ ان کے سروں پر  
طاہر بیٹھا ہوا ہے، کیونکہ وہ سب اسکی شجاعت سے آگاہ تھے۔  
جناب میر پہلی ہی آواز میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ مگر رسول اللہ نے  
انہیں روک دیا، لیکن جب ہر طرف خاموشی چھائی رہی اور عمر ابن عبدود  
کی لہن ترانیاں بڑھنے لگیں تو رسول اللہ نے جناب میر ہی کو اجازت دی  
اور آخر کار انہیں کی تلوار نے اس ہم کو بھی سر کیا۔

۴۔ صلح حدیبیہ واقع ہوئی۔ رسول اللہ بظاہر حج کے ارادہ سے  
تشریف لے گئے تھے لیکن مشرکین کے سد راہ ہونے سے آپ نے حج کا ارادہ  
۱۔ موطا امام مالک مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی صفحہ ۱۷۲، ۱۷۳ تاریخ خمیس جلد اصفیہ ۱۲۸۴ھ

ترک فرما دیا اور چند شرائط کے ماتحت صلح کر لینا منظور فرمالیا۔ یہ شرطیں ایسی  
تھیں جن سے رسول اللہ کی طرف ایک قسم کی کمزوری کا پہلو نمایاں تھا۔  
اس صلح نامہ کے کاتب حضرت علیؑ تھے لیکن دوسرے اصحاب کو اس موقع پر  
طرح طرح کے شکوک پیدا ہو گئے اور اس رواداری پر عجب قسم کے غصہ و  
غم کی لہر دوڑ گئی۔

طبری نے لکھا ہے :-

قد کان اصحاب رسول الله خرجوا  
وهم لا يشكون في الفتح لرويا  
راه رسول الله فلما راوا ما  
راءوا من الصلح والرجوع وما  
تعمل عليه رسول الله في نفسه  
دخل الناس من ذلك امر عظيم  
حتى كادوا ان يهلكوا له

جو صحابہ رسول اللہ کے ساتھ آئے تھے  
انہیں یقین تھا کہ فتح ہوگی کیونکہ رسول اللہ  
نے ایک خواب دیکھا تھا۔ لیکن جب انہوں نے  
دیکھا کہ حضرت نے صلح کر لی ہے اور  
سخت شرائط منظور کر کے واپس چلے  
ہیں تو ان کے دلوں میں ایسی بری باتیں  
پیدا ہوئیں کہ قریب تھا وہ ہلاکت یعنی  
گمراہی میں مبتلا ہو جائیں۔

حضرت عمر کا جو عالم تھا وہ خود ان کی زبان سے سنئے :-

انیت النبی فقلت الست  
میں رسول اللہ کے پاس آیا اور کہا کیا



بنی اللہ قال بلی قلت السنا  
 علی الحق وعدونا علی الباطل  
 قال بلی، قلت فلم نعط لدنیۃ  
 فی دیننا اذا قال فی رسول اللہ  
 ولست اعصیہ وهو ناصری  
 قلت اولیس کنت قد سنا  
 اناسنا فی البیت تطوف بہ  
 قال بلی افا خبرت اناناتیہ  
 العام، قلت لا قال فانک  
 اتیہ وتطوف بہ قال فانیت  
 ابابکر فقلت یا ابابکر  
 الیس هذا بنی اللہ حقا قال  
 بلی قلت السنا علی الحق وعدونا  
 علی الباطل قال بلی قلت فلم  
 الدنیۃ فی دیننا اذا قال  
 اتی الرجلہ فی رسول اللہ و  
 اعصی بہ وهو ناصری واستمسک

آپ رسول خدا نہیں ہیں کہا کیوں نہیں  
 میں نے کہا کیا ہم حق پر اور ہمارا  
 دشمن ناحق پر نہیں ہے، فرمایا ہاں  
 ایسا ہی ہے۔ میں نے کہا پھر تم اس  
 ذلت کو کیوں برداشت کریں، فرمایا  
 میں خدا کا رسول ہوں اور خدا کے  
 حکم کے خلاف نہیں کرتا اور وہی میرا  
 مددگار ہے۔ میں نے کہا کیا آپ نے  
 ہم سے نہیں کہا تھا کہ ہم غنقریہ خانہ  
 کعبہ کی طرف جائیں گے اور اس کا طواف  
 کریں گے۔ حضرت نے فرمایا کیوں نہیں  
 لیکن کیا میں نے اسی سال کیلئے  
 کہا تھا میں نے کہا کہ یہ تو نہیں  
 کہا تھا، فرمایا پھر میں اب بھی  
 وہی کہتا ہوں کہ میں خانہ کعبہ  
 آؤں گا اور یہاں کا طواف  
 کروں گا۔

بغزرة فوالله انه على الحق قلت  
وليس كان يحدثنا اناسنا  
البيت فظوف بر قال مبي  
افا خبرك انك تاتيہ العام قلت  
لا فقال فانك اتية فظوف به

فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میں  
ابو بکر کے پاس گیا اور ان سے  
بھی وہی گفتگو کی جو رسول اللہ  
سے کی تھی۔

ضمیمہ نمبر ۲۰

طبری کی روایت میں آپ کا پہلے حضرت ابو بکر کے پاس اور پھر آنحضرت  
کے پاس جا کر سوال و جواب کرنا تحریر ہے۔ تاریخ خمیس (جلد ۲ صفحہ ۲۲) میں  
ہے کہ حضرت عمر نے کہا:-

والله ما شلكت منذ اسلمت الا يومئذ (جبے میں اسلام  
لایا کبھی مجھے شک نہیں ہوا، جیسا اُس دن ہوا)  
یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت عمر فرماتے تھے "کہ میں نے اس جبارت کے  
کفارہ میں بہت نمازیں پڑھیں اور روزے ادا کئے۔"

الغرض صلح حدیبیہ کی وجہ سے صحابہ رسول اللہ سے اس قدر خفا ہو گئے  
تھے کہ جب صلح کے بعد رسول اللہ نے اپنے اصحاب سے فرمایا کہ "قوموا، فافروا  
ثم اخلقوا" (اٹھو قربانیاں کرو اور سر منڈ واؤ) تو ان میں سے ایک بھی  
آواہ نہ ہوا، یہاں تک کہ حضرت نے تین مرتبہ فرمایا اور جب اسکے بعد کبھی کسی نے



تعمیل حکم نہ کی تو حضرت کبیدہ خاطر ہو کر حضرت ام سلمہ کے خیمہ میں تشریف لیگئے۔  
جب رسول اللہ قربانی کرنے کے بعد سرمنڈوا چکے لوگوں نے بادل ناخواستہ  
خود بھی قربانیاں شروع کیں۔ "بادل ناخواستہ" کا حال ابن عباس کی روایت  
ذیل سے معلوم ہو سکتا ہے۔

کچھ لوگوں نے حدیبیہ کے دن سرمنڈوا لیا  
اور بعض نے بال ترشوائے رسول اللہ  
نے فرمایا سرمنڈوانے والوں پر خدا کی لعنت  
کرے لوگوں نے کہا اور بال ترشوائے  
والوں پر، آپؐ پھر وہی کہا۔ آخر تیسری  
مرتبہ کہا کہ بال ترشوائے والوں پر بھی  
رحمت ہو، لوگوں نے پوچھا کہ آپؐ نے  
ان کو کیوں ترجیح دی، فرمایا کہ  
انہوں نے شک نہیں کیا تھا۔

— ❦ —

خلق رجال يوم الحديبية و  
فصل اخرون فقال رسول الله  
يرحم الله المحلقين ، قالوا  
والمقصرين يا رسول الله قال  
يرحم المحلقين قالوا والمقصرين  
يا رسول الله قال يرحم المحلقين  
قالوا يا رسول الله والمقصرين  
قال والمقصرين قالوا يا رسول  
الله فلم تظاهر للرحم للمحلقين  
دون المقصرين قال لا نعم  
لم يشكوا۔

۱۵ تاریخ طبری جلد ۳ صفحہ ۸۰۔ تاریخ خمیس جلد ۲ صفحہ ۲۵۔

۱۶ تاریخ طبری جلد ۳ صفحہ ۸۱۔ تاریخ خمیس جلد ۲ صفحہ ۲۵۔

محمد بن سعد کا تب و اقدی کی روایت ہے کہ حضرت عثمان اور ابوقحافہ  
نے سر نہیں منڈوایا تھا۔

شہر میں خیر کی ہم درمیش ہوئی۔ اتفاق سے جناب امیر کی آنکھیں  
آشوب کراچی تھیں اور آپ مدنیہ ہی میں رہ گئے تھے۔ خیر کے قلعوں میں جو  
زیادہ مضبوط قلعہ تھا وہ دشمن کا مرکز تھا۔

تین روز تک متواتر حضرت ابو بکر اور حضرت عمر پرچم اسلام لیکر تشریف  
لے گئے، لیکن ہر بار ناکام واپس آئے۔

تاریخ طبری میں لکھا ہے کہ آنحضرت نے علم حضرت عمر کو دیا اور بہت  
لوگ آپ کے ساتھ گئے لیکن خیر والوں سے مقابلہ ہوا تو آپ کے  
ساتھیوں کے پاؤں اکٹھے اور سالٹا کے پاس واپس آئے۔ اس حال میں  
کہ ساتھ والے ان پر زولی کا الزام لگاتے تھے اور آپ ساتھیوں پر۔

جب یہ صورت دیکھی تو رسول اللہ نے فرمایا :-

اما والله لا عطين الواية      کل میں علم اس شخص کو دوں گا جو  
عند ارجلا کوارا عند فراد      بھاگنے والا نہیں ہے جو اشراروں کو

۱۔ طبقات ابن سعد جلد ۱ مطبوعہ لیڈن صفحہ ۵، ۲۔ تاریخ خمیس جلد ۳ صفحہ ۵۳

السيرة النبوية عبد الملك بن هشام بر حاشیہ روض الالف جلد ۱ صفحہ ۲۳۹ ۳۔ تاریخ طبری  
جلد ۳ صفحہ ۹۳



حبیب اللہ و رسولہ و حبیبہ اللہ  
و رسولہ یفتح اللہ علی یدہ

دوست رکھتا ہے اور جسے اللہ رسول  
دوست رکھتے ہیں۔ خدا اسی کے ہاتھوں  
سے فتح کرائے گا۔

بعض روایات میں "کرا را غیر فرار" کا لکھا نہیں ہے (ملاحظہ ہو صحیح  
بخاری جلد ۳ صفحہ ۲۳ و طبقات ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۸۰) لیکن اگر اس ٹکڑے  
کو علحدہ کر دیا جائے تو معنی تشنہ رہتے ہیں، کیونکہ صورت حال یہ تھی کہ برابر  
تین دن سے صحاب کی سرگردگی میں ہمیں کبھی جا رہی تھیں اور برابر وہ لوگ  
شکست کھا کر واپس آجاتے تھے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ رسول اللہ نے  
یہی کہا ہوگا کہ کل میں اسکو علم دوں گا جو جاگ کر واپس نہ آئے ورنہ کہنے کی ضرورت  
ہی کیا تھی، علاوہ اسکے اس فقرہ کو علحدہ کرنے سے یہی پیدا ہوتے ہیں کہ "کل  
میں علم اسکو دوں گا جو خدا و رسول کو دوست رکھتا ہے اور جسے خدا و رسول  
دوست رکھتے ہیں، گو یادہ لوگ جو اس سے قبل پرچم اسلام لیکر خیر فتح کرنے  
گئے تھے وہ خدا و رسول کے دوست نہ تھے اور اس صورت میں صحابہ کی اور  
زیادہ توہین ثابت ہوتی ہے۔

بہر حال "کرا را غیر فرار" کا لکھا ہوا یا نہ ہو، یہ امر مسلم ہے کہ رسول اللہ تین دنوں

۱۵ تاریخ خمس جلد ۲ صفحہ ۵۳ خصائص نائی صفحہ ۱۱۔ الریاض النضرہ جلد ۲ صفحہ ۸

سیرۃ نبویہ عبد الملک روض الالف جلد ۲ صفحہ ۲۳۹۔ استیعاب جلد ۲ صفحہ ۳۷۳

کی سلسل ناما کامیوں کی وجہ سے کسی شخص کا انتخاب کرنا چاہتے تھے جس کا  
انہما رائے ان الفاظ میں فرمایا۔

اس خبر کے سننے کے بعد صواب یہ کیا اثر ہوا؟ اس کا حال بخاری کے  
الفاظ میں سنئے۔

<p>تمام رات لوگوں نے چہ میگوئیوں میں بسر کر دی اور جب صبح ہوئی تو ہر شخص یتھنائے ہوئے تھا کہ علم اسے ملیگا۔</p>	<p>فیات الناس ید وکون لیلتم اچھم یعطاه فلما اصبح الناس عندوا کلهم یرجون یعطاه۔</p>
---	--

طبقات اپنی سعد کا تب وادی میں ہے: "حضرت عمر کا بیان ہے کہ مجھے بھی  
اس دن سے پہلے سرداری کی خواہش نہیں ہوئی تھی مگر اس دن میں ادنیٰ ہو ہو کر  
دیکھ رہا تھا اور منتظر تھا کہ علم مجھ کو دیا جائے گا۔<sup>۱۰</sup>  
طبری نے لکھا ہے کہ جب دوسرا دن ہوا تو حضرت ابو بکر اور حضرت عمر  
کے واسطے گردنیں ادنیٰ کر کے دیکھنے لگے۔"

لیکن اس دوسرے دن صبح کو کیا ہوا؟ حضرت نے علم کو لیکر جنبش دی اور  
فرمایا کون اس کو لیتا ہے، ایک صاحب آگے بڑھے اور کہا میں۔ آپ نے فرمایا،  
جاءوا آگے بڑھو، قسم اس خدا کی جس نے محمد کے چہرہ کو عورت دی ہے میں  
یہ علم اس شخص کو دوں گا جو بھاگنے والا نہیں ہے۔ اے علی، اٹھو اور علم لو،<sup>۱۱</sup>

۱۰ طبقات جلد ۲ صفحہ ۷۰، تاریخ طبری جلد ۳ صفحہ ۹۳۔ ۱۱ الریاض النضرہ جلد ۲ صفحہ ۸

چنانچہ آپ نے علم لیا، قلم فتح کیا اور کامران و بامراد واپس آئے۔



شہر میں مکہ معظمہ فتح ہوا اور مسلمان خوشیاں منا رہے تھے، لیکن نبیؐ اور علیؑ دو ہستیاں ایسی تھیں جو اسلام کی خدمت سے غافل نہ تھیں۔ وہ ہضام جو خانہ کعبہ میں نصب کر دئے گئے تھے، رسالتآب اور علی ابن ابیطالب ان بتوں کو توڑنے کی خدمت انجام دے رہے تھے۔ وہ بت جو سب سے بڑا تھا اور خانہ کعبہ کے اوپر نصب تھا اس کے توڑنے کے لئے رسول اللہؐ نے علیؑ کو اپنے کاندر سے پر بلند کیا اور آپؐ نے اس کو توڑ ڈالا۔

مورخ دیار بکری نے لکھا ہے کہ اس وقت رسول اللہؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا۔  
 طوبی لک تعمل للحق وطوبی  
 لى احمى للحق۔  
 (مبارک ہو تم کو تم حق کے لئے کام کر رہے  
 ہو اور خوشحال میرا کہ میں حق کیلئے تمہارا  
 بار اٹھائے ہوئے ہوں یہ)

یہ باتیں بظاہر دیکھنے میں بہت معمولی حیثیت رکھتی ہیں لیکن انہی جزئی واقعات سے عمومی تاریخ مرتب ہوتی ہے اور ایک مورخ انہیں واقعات صحیح نتیجہ تک پہنچنے میں کامیاب ہوتا ہے۔

اسی سال کے آخر میں چین کی جنگ ہوئی یہ رسول اللہؐ کی آخری لڑائی تھی



کیونکہ اس کے بعد جنگ ہوئی جس میں رسول اللہ بغیر جنگ کے ہوئے وہیں آگئے تھے،  
اس لڑائی کی کیفیت بڑی حسرت خیز و حیرت انگیز ہے اور قرآن مجید میں  
اس کی کیفیت حسب ذیل الفاظ میں بیان کی گئی ہے :-

<p>اور حنین کے دن کو یاد کرو جبکہ تمہاری کثرت نے تمہیں مغرور بنا دیا تھا مگر اس تمہیں کوئی فائدہ نہ پہنچا یا اور زمین تم پر تنگ ہو گئی اور تم نے جنگ میں پیش قدمی دکھا دی۔</p>	<p>و یوم حنین اذا عجبکم کثرکم فلم تغن عنکم شیئا و ضاقت علیکم الارض بما رحت ثم ولیتم مدبرین۔</p>
--	---

صورت یہ ہوئی کہ دشمن کی فوج کیننگاہ میں تھی، اُس نے احباب تک حملہ کر دیا اور  
مسلمانوں کے قدم اٹھ گئے۔ سوائے سات آٹھ آدمیوں کے کوئی باقی نہ رہا۔  
ان آٹھ آدمیوں کی فہرست میں اکثر کتابوں میں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر  
کا نام بھی نظر آتا ہے لیکن صحیح بخاری میں ابوقنادہ کی روایت یہ ہے۔  
"تمام مسلمانوں نے راہ فرار اختیار کی اور میں بھی اُن کے ساتھ بھاگا، ایک  
مرتبہ میں نے دیکھا کہ سب کے ساتھ حضرت عمر بھی ہیں، میں نے کہا یہ کیا ہوا  
آجے فرمایا کیا جاؤں خدا کی مرضی۔ پھر اس کے بعد رفتہ رفتہ لوگ  
رسالتاب کے پاس واپس آ گئے۔"

محدث ابن ابی شیبہ کا بیان ہے کہ :-

”آنحضرت کے ساتھ صرف چار آدمی رہ گئے تھے، تین نبی ہاشم میں سے اور ایک اور جنکی تفصیل یہ ہے۔ علی و عباس آچے آگئے تھے، ابوسفیان لگام بکڑے ہوئے تھے اور ابن مسعود پہلو میں تھے اور کوئی شخص دشمنوں میں سے حضرت کی طرف نہ بڑھتا تھا مگر یہ کہ وہ قتل ہو جاتا تھا۔“

ان فرار کرنے والوں پر ایک عورت ام سلمہ بنت ملحان نے انتہائی غم و غصہ کا اظہار کیا، وہ رسالت کے پاس سے بالکل جدا نہیں ہوئی حضرت نے پکار کر فرمایا ”ام سلمہ“ اس نے کہا :- ”جی حضور، میرے ماں باپ آپ پر نثار، آخر آپ فرار ہونے والوں کو قتل کیوں نہیں کر دالتے؟“ حضرت نے اس کے جواب میں صرف اس قدر ارشاد فرمایا کہ ”یہ بھاگ جاتے ہیں، تو کیا ہوا خدا کافی ہے۔“

استیعاب میں حضرت عباس کے حالات میں لکھا ہے کہ :-

”حنین کے دن آنحضرت کے پاس سے سب فرار کر گئے سوا عباس، عمر، علی اور ابوسفیان کے، بعض لوگوں نے کہا ہے کہ سات آدمی حضرت ہی کے گھر کے رہ گئے تھے، ابن اسحاق نے کہا ہے کہ یہ سات آدمی، علی، عباس، فضل، ابن عباس، ابوسفیان، جعفر بن ابی سفیان، ربیعہ بن عارض اور اسامہ بن زید ہیں اور ان کے علاوہ آٹھ ہیں امین ابن عبید۔“

۱۵ موارب لرنیہ جلد ۱ صفحہ ۱۶۳ سے طبری جلد ۳ صفحہ ۱۲۹۔

بعض مورخوں نے ابوسفیان کے بجائے حضرت عمر کا نام لیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابوسفیان تو یقیناً حضرت کے ساتھ تھے، حضرت عمر کے متعلق بیشک اختلاف ہے۔ ۱۷

اس جنگ سے فارغ ہونے کے بعد رسول اللہ نے طائف کا محاصرہ کیا، کیونکہ مشرکین وہاں پناہ گزیں ہو گئے تھے۔ اسی دوران میں ایک دن رسول اللہ نے جناب امیر کو بلا کر بڑی دیر تک راز کی گفتگو کی۔ اس پر لوگوں میں یہ میگوئیاں ہونے لگیں اور کہا:۔ لقد طال نجواه مع ابن عمہ (آج تو رسول اللہ اپنے ابن عم سے بڑے طولانی مشورے کر رہے ہیں)۔ رسول اللہ نے سنا تو فرمایا: ما انتجیتہ ولكن الله انتجاہ۔ (میں نے علیؑ کو مشورے کے لئے منتخب نہیں کیا ہے بلکہ خدا نے کیا ہے)۔ اس روایت کو حافظ ترمذی نے درج کیا ہے اور حسن صحیح قرار دیا ہے۔ ۱۸

۹۔ میں غزوہ تبوک واقع ہوا۔ رسول اللہ کی زندگی کو صرف ایک سال باقی ہے اور یہ غزوہ آخری غزوہ ہے مگر می کا زمانہ ہے شدت کی کوئل رہی ہے اور رسالتا کے اپنے ساتھ چلنے کے لئے تمام صحاب کو حکم دیا ہے لیکن حضرت علیؑ کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ تم مدینہ میں قیام کرو اور میری جگہ رہو۔ حضرت علیؑ



کبیدہ خاطر ہو کر کہتے ہیں :-

لخلفنی فی الصبیان والنساء (کیا آپ مجھے بچوں اور عورتوں میں

چھوڑ جائینگے)

حضرت جواب دیتے ہیں :- اما ترضی ان تكون منی بمنزلة هارون

من موسیٰ الا انه لا بنی بعدی (کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ تم مجھ سے

وہی نسبت رکھو جو ہارون کو موسیٰ سے تھی، سوائے اس کے کہ میرے بعد کوئی

بنی ہونے والا نہیں ہے۔)

اگر آخری جملہ "لا بنی بعدی" کا نہ ہوتا تو ہارون کی منزلت کو صرف

وقتی جانشینی اور عارضی خلافت تک محدود سمجھا جاسکتا تھا لیکن اس جملہ سے

ثابت ہوتا ہے کہ زندگی میں اور بعد وفات دونوں حالتوں میں جناب امیر کو اسی

جانشینی اور خلافت کا درجہ حاصل ہے جو ہارون کو موسیٰ کے بعد حاصل ہوا۔

دنیا کو معلوم ہے کہ ہارون موسیٰ کے شریک کار، معاون اور وزیر و جانشین

تھے اور اگر ان کی زندگی موسیٰ کے بعد باقی رہتی تو خلافت کا حق سوائے ان کے

کسی کو نہ پہنچتا۔ بالکل اسی طرح جناب امیر کے لئے ثابت ہوتا ہے کہ وہ حیات

۱۔ صحیح بخاری جلد ۳ صفحہ ۵۴۔ تاریخ خمیس جلد ۲ صفحہ ۱۳۸ تاریخ طبری جلد ۲ صفحہ

۱۳۴۔ الریاض النضرہ جلد ۲ صفحہ ۱۶۲۔ سیرۃ ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۳۱۷۔ مؤید النبیین

جلد ۱ صفحہ ۱۷۳۔ تاریخ الخلفاء سیوطی ۱۶۷ و ۱۶۸۔

مات ہر حالت میں رسول اللہ کے جانشین تھے اور اگر ہارون سے کوئی فرق تھا تو صرف یہ کہ ہارون نبی تھے اور رسول اللہ کے بعد سلسلہ نبوت ختم ہو گیا لیکن اگر یہ سلسلہ ختم نہ ہوتا تو نبی بھی سوائے حضرت علیؑ کے دوسرا نہ ہوتا۔

اسی سال کا واقعہ ہے کہ سورہ برأت کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں جن کا اعلان مکر معظمہ میں حج کے موقع پر ہونا تھا، اس واقعہ کے متعلق مختلف روایات ہیں۔ نسانی کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے حضرت ابوبکر کو ان آیات کے ساتھ روانہ کر دیا تھا۔ اس کے بعد ان کو واپس بلا کر یہ خدمت حضرت علیؑ کے سپرد کی، دوسری روایت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کو واپس نہیں بلایا بلکہ خود حضرت علیؑ کو روانہ کیا کہ حضرت ابوبکر سے وہ آیات لیکر خود اس خدمت کو انجام دیں۔ بہر حال ان تمام روایات میں رسول اللہ کا یہ قول قدر مشترک کے طور پر پایا جاتا ہے کہ۔ علی منی وانا منہ ولا یؤدی عنی الا انا وعلی یعنی علی مجھ سے ہے اور میں علی سے اور انہی تر جانی یا میں خود کر سکتا ہوں یا علی۔ دوسری روایت میں یہ الفاظ اس طرح پائے جاتے ہیں:- انی امرت ان ابلفہ انا اور رجل من اہل بیتی (مجھے حکم دیا گیا ہے کہ یا میں خود اس کو پہنچاؤں یا ایسا شخص جو میرے اہل بیت میں داخل ہو)

۱۵ خصال نسانی صفحہ ۶۱-۶۲۔روض الانف جلد ۲ صفحہ ۳۲۸۔طبری جلد ۳ صفحہ ۲۵۰  
تاریخ خمیس جلد ۲ صفحہ ۱۵۰۔ریاض نصرہ صفحہ ۱۷۴۔

بہر حال حضرت ابوبکرؓ روانہ ہو چکے تھے یا نہیں، وہ واپس بلائے گئے یا نہیں  
 یہ مسلم ہے کہ آیات قرآنی کی تبلیغ کے لئے حضرت نے جناب امیر کو منتخب کیا اور یہ  
 کہہ کر کہ اس خدمت تبلیغ کا اہل میں ہوں یا پھر وہ جو میرے اہلبیت میں داخل ہو  
 شاہد میں رسول اللہؐ نے جناب امیر کو مین کی طرف تبلیغ کے لئے روانہ کیا اور  
 اس شان سے کہ عقد لواء و عہد بیدار و رخی طرفہا من قدامہ غو  
 خراج و من خلفہ قید شبر۔ (حضرت نے ان کے لئے علم طیار کیا خود اپنے  
 ہاتھ سے ان کے سر پر عمامہ باندھا اور عمامہ کا ایک سر آگے کی طرف قریب ایک  
 ہاتھ کے سینہ پر ڈال دیا اور دوسرا سر پشت کی طرف ایک بالشت لٹکا دیا۔  
 اس ہم کی سرکردگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام قبیلہ سہدان اور اکثر اہل مین ایک ہی  
 دن میں آپ کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہوئے اور آپ مدینہ واپس لوٹے۔ اس ہم  
 پر پہلے خالد ابن ولید کی نامزدگی ہو چکی تھی اور چونکہ حضرت علیؓ کے بھیجے جانے  
 سے وہ معزول ہوئے اسلئے بعض حضرات کو یہ بات بہت ناگوار ہوئی۔ اور اس کا  
 انتقام یوں لیا گیا کہ چند لوگ جناب علیؓ کی شکایت لیکر مدینہ پہنچے کہ آپ نے  
 اموال خمس میں سے ایک کنیز پر بغیر اجازت رسولؐ تصرف کر لیا۔ اس کا جواب  
 رسول اللہؐ نے دیا ہے وہ کتب احادیث میں اتنا محفوظ ہے۔ ملاحظہ ہو :-  
 عمران بن حصین کی روایت ہے کہ اقبل رسول اللہ وال غضب یعرف  
 ۱۵ تاریخ حمیس جلد ۲ صفحہ ۱۶۰ ۱۵ بخاری مطبوعہ مصر جلد ۲ صفحہ ۲۳ -



فی وجہ فقال ما تريدون من علی ثلاثا ان علیا منی وانا منه وهو  
ولی کل مومن بعدی (حضرت مخاطب ہوئے مگر اس طرح کہ غصہ آکے  
چہرہ سے نمایاں تھا اور کہا تم لوگ علیؑ سے کیا چاہتے ہو، آخر کیا چاہتے ہو۔ علیؑ  
مجھ سے ہے، میں علیؑ سے ہوں اور وہ ہر مومن کا میرے بعد ولی ہے۔  
یہ میری روایت میں ہے :-

لما اتیت النبی دفعت الكتاب فقرأه علیه فرأیت الغضب  
فی وجهه فقال لا تقع فی علی فانه منی وانا منه وهو ولیکم بعدی -  
(یعنی جب میں آیا اور حضرت کو خط دیا تو آپ نے پڑھنا شروع کیا اور چہرہ پر غصہ کے  
آثار نمایاں ہوتے جا رہے تھے۔ آپ نے فرمایا علیؑ کی برائی نہ کرو، وہ مجھ سے  
ہے میں اس سے ہوں اور وہ تمہارا حاکم ہے میرے بعد)  
علامہ ابن حجر مکی شرح قصیدہ ہمزئیہ میں لکھتے ہیں :-

ما صح عنه صلی اللہ علیہ وسلم وهو اللہم وال من کالاه وعا  
من عاداه ان علیا منی وانا منه وهو ولی کل مومن بعدی -  
صحیح بخاری سے ثابت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا خداوند ارادوست رکھے جو علیؑ کو دوست  
رکھے اور دشمن رکھے پس جو علیؑ کو دشمن رکھے اور یہ کہ علیؑ مجھ سے ہے، میں علیؑ سے ہوں اور  
وہ ولی ہے ہر مومن کا میرے بعد)

۱۔ دایمن لغزہ جلد ۲ صفحہ ۱۰۱۔ خلاصہ نسائی صفحہ ۳، ۵، ۷۔ تہذیب طبری جلد ۱۰ صفحہ ۲۳۰۔

اسی مسئلہ کے آخر میں رسالتکاتب نے آخری حج کیا ہے جو حجتہ الوداع کے نام سے مشہور ہے، یہ جناب رسالتکاتب کی زندگی کا آخری زمانہ ہے اور صرف چند ماہ آپ کی رحلت کو باقی ہیں۔

جناب امیر زکوٰۃ و خمس لینے یمن چلے گئے تھے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے روانہ ہوئے لیکن آپ وہاں سے واپس آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مل گئے تھے اس موقع پر بھی جناب امیر کی دیانت و امانت سے فوج والوں کو شکایت پیدا ہو گئی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ جب آپ یمن سے واپس ہوئے اور مکہ معظمہ کے قریب پہنچے تو آپ فوج سے علیحدہ ہو کر پہلے پہنچ گئے اور صحابہ میں سے ایک شخص کو فوج کا سردار بنا آئے۔ اس قائم مقام سردار نے تمام اسباب و اموال میں سے جو یمن سے آیا تھا لباس فاخرہ نکلوا کر فوج کے تمام سپاہیوں کو پہنوا دیا، جب فوج کا داخلہ ہونے لگا تو حضرت علی معائنہ کے لئے گئے اور یہ دیکھ کر بہت مدہم ہوئے اور تمام لباس اتر دیا اموال میں پھر شامل کر دیا۔ یہ بات بھی لوگوں کو بہت ناگوار ہوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی گئی تو آپ نے ایک عام تقریر کی اور فرمایا۔ لا تشکوا علیا فواللہ اند لا خشن فی ذات اللہ من ان یشکی (یعنی علی کی شکایت نہ کرو، خدا کی قسم وہ اللہ کی مرضی کے لئے اتنا بے لوث ہے کہ اسکی شکایت کا موقعہ ہی نہیں ہے)۔

سیرۃ ابن ہشام بر حاشیہ روض الالف جلد ۲ صفحہ ۳۵۱۔ طبری جلد ۳ صفحہ ۱۶۸۔ استیعاب مطبوعہ حیدرآباد صفحہ ۵۷، صواعق محرقة مطبوعہ مصر صفحہ ۷۶۔

یہ حج سے پہلے کا واقعہ ہے۔ اب وہ وقت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے فارغ ہو کر مدینہ واپس تشریف لارہے ہیں حضرت چلتے چلتے غدیر خم تک پہنچتے ہیں، پورا قافلہ روک دیا جاتاہے اور اعلان ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ تقریر فرمایا گئے۔ ہزاروں آدمی خطبہ نبوی سننے کیلئے مجتمع ہیں اور آپ منبر پر تشریف لیجا کر ایک مبسوط خطبہ کے ذریعہ سے اپنے قرب وفات کی پیشین گوئی کرتے ہیں، اپنی خدمات ہدایت کا ذکر فرماتے ہیں، لوگوں سے اصول اسلام و ایمان کی گواہی لیتے ہیں اور اس کے بعد وہ کچھ فرماتے ہیں جس سے انکار کی گنجائش نہیں اور جس نے ہمیشہ کے لئے آپ کی جانشینی کے مسئلہ کو حل فرمادیا۔

اس سلسلہ میں حافظ طبرانی کی روایت جو بہ سند صحیح منقول ہے۔ حسب ذیل ہے:-

ایھا الناس انی یوشک ان ادعی فاجیب وانی مسؤل فامنکم  
 مسؤلون فماذا انتم قائلون (مسلمانو، غفریب مجھے بلا لیا جائے گا اور میں  
 تم سے نصیحت ہو جاؤں گا، میں بھی جوابدہ ہوں اور تم بھی جوابدہ ہو اس لئے  
 بتاؤ کہ جب یہ وقت آئے گا تو تم کیا کہو گے)

فقال لیس تشہدون ان لا اله الا الله وان محمد عبده  
 ورسوله وان جنتہ حق وان نارہ حق وان المبعث حق بعد  
 الموت وان الساعة اتیة لا ریب فیہا وان الله یبعث من فی



القبور قالوا بلی لشہد بذلک قال اللہم اشہد۔ ثم قال یا ایہا الناس  
 ان اللہ مولای وانا مولی المومنین وانا ولی ہمد من انفسہم  
 فمن کنت مولاه فہذا مولاه یعنی علیاً اللہم وال من کلاہ وعا د من  
 عا د اہ (حضرت نے فرمایا کیا تم لوگ اس بات کی گواہی نہ دو گے کہ سوائے اللہ  
 کے کوئی خدا نہیں اور یہ کہ محمد خدا کا بندہ اور رسول ہے اور جنت حق ہے،  
 جہنم حق ہے اور موت حق ہے اور زندگی بعد موت کے حق ہے اور قیامت آنے  
 والی ہے اس میں کوئی شک نہیں اور خدا مردوں کو زندہ کرے گا۔ سب نے کہا  
 ہاں، ہم اس کی گواہی دیتے ہیں، حضرت نے فرمایا، خداوند اگواہ رہنا۔  
 پھر فرمایا اے لوگو خدا میرا مولا ہے اور میں تمام مومنین کا مولا ہوں اور  
 ان کے نفسوں کا خود ان سے زیادہ حقدار ہوں۔ اسکے بعد حکامین کو لا  
 ہوں، اس کا یہ مولا ہے (علی کی طرف اشارہ کیا) خداوند دوست رکھا  
 جو علی کو دوست رکھے اور دشمن رکھا اسکو جو علی کو دشمن رکھے) ثم قال  
 ایہا الناس انی فرطکم وانتم وارس دون علی الحوض وانی اسئلکم  
 حین تودون علی عن الثقلین فانظرونی کیف تخففون فیہما  
 الثقل الاکبر کتاب اللہ سبب طرفہ بید اللہ وطرفہ بایدکم  
 فاستمسکوا فبالا تزلوا ولا تبدلوا وعترتی اہل بیتی فانرفد  
 نبائی اللطیف الخیر انھما لن ینقضیا حتی یردا علی الحوض (حضرت نے)

فرمایا لوگو، میں تمہارے آگے جاتا ہوں اور تم حوض کوثر پر میرے پاس پہنچو گے  
 تو میں تم سے دریافت کروں گا کہ تم نے میرے بعد ثقلین کے ساتھ کیا سلوک کیا  
 ایک ان میں سے کتاب خدا ہے جو ایک زنجیر ہے جس کا ایک سرا خدا سے متصل  
 اور دوسرا سرا تمہارے پاس ہے اس کو کپڑے رہو، گمراہ نہ ہو اور ادا دل بدل  
 نہ کرو، دوسرے میری عترت، میرے اہلبیت۔ خدا نے مجھے بتایا ہے کہ یہ  
 دونوں فنا نہ ہوں گے جب تک میرے پاس حوض کوثر پر وارد نہ ہوں (علامہ ابن حجر مکی نے صواعق محرقہ مطبوعہ مصر صفحہ ۲۵-۲۶) میں اس  
 روایت کو درج کیا ہے اور لکھا ہے کہ حضرت نے تین مرتبہ صحابہ سے دریافت  
 کیا اے ابی بکر من انفسکم کیا میں تم پر تم سے زیادہ اختیار نہیں  
 رکھتا سب نے کہا بیشک، بیشک، بیشک اور پھر اس کے بعد رسول اللہ نے  
 حضرت علیؑ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر فرمایا:۔

من كنت مولاة فعلى مولاة اللهم وال من ولاه وعاد من عاداه  
 وانصر من نصره واخذل من خذله واد الحق حيث دار بيني  
 جس کا میں مولی ہوں علیؑ اس کا مولی ہے خداوند دوست رکھ اس کو جو اسے  
 دوست رکھے اور دشمن رکھ اسے جو اسے دشمن رکھے، مدد کر اس کی جو اس کی  
 مدد کرے، ساتھ چھوڑ اس کا جو اس کا ساتھ چھوڑے اور حق کو اس طرف گردش  
 دے جس طرف وہ گردش کرے (

اس کے بعد اس روایت پر تبصرہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :-  
 "یہ حدیث صحیح ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں، اور ترمذی، نسائی، احمد بن  
 حنبل وغیرہ ایک جماعت نے اس کی تخریج کی ہے اور اس کے طرق و شناد  
 بہت زیادہ ہیں، چنانچہ ۱۶ صحابیوں نے اسکی روایت کی ہے اور احمد بن حنبل  
 کی ایک روایت میں ہے کہ ۳۰ صحابیوں نے اس کے سننے کی گواہی دی ہے  
 اور اس کے اسناد اکثر صحیح و حسن ہیں۔"

استیعاب بن عبد البر۔ اسد الغابہ ابن اثیر جزری میں منقول مقام پر یہ  
 روایت مذکور ہے۔ حافظ محب طبری نے اس روایت کو نقل کرنے کے بعد  
 لکھا ہے کہ :-

"اس واقعہ کے بعد حضرت عمر بن خطاب علی سے ملے اور کہا کہ مبارک ہو  
 آپ کو کہ آپ ہو گئے ہر مومن و مومنہ کے مولا۔"

۔۔۔

اب رسولؐ کی زندگی صرف دو ماہ اور چند دن کی باقی رہ گئی ہے اور مسلمانوں  
 کی شب بیدار جب ہاتھ کو ہاتھ نہ سمجھائی دے گا نزدیک ہے۔ ایسے واقعات کا  
 ذرا جائزہ لیں، شاید رسولؐ کے بیانات سے کوئی شمع ہدایت ایسی

۱۵ صواعق محررہ مطبوعہ مصر صفحہ ۲۵۔ ۵۲ مطبوعہ حیدرآباد جلد ۲ صفحہ ۳، ۴ جلد ۳

صفحہ ۳۵ جلد ۳ صفحہ ۲، ۳، ۴، ۵۔ ۳۲۱، ۳۰۴، ۳۰۵ ریاض نضرہ جلد ۲ صفحہ ۱۶۹



مل جائے جو تجلیات نبوی کے اوجھل ہو جانے کے بعد ہمارے لئے دلیلِ اہم بن کر۔  
گزشتہ صفحات کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ شروع سے اخیر تک  
ہر موقع پر رسولؐ کے ساتھ مواسات و ہمدردی میں پیش پیش رہنے والا، کسی  
موقع پر قدم میں تزلزل نہ آنے دینے والا اور سخت سے سخت وقت میں طاقت  
رسولؐ سے سر مواسات نہ کرنے والا کون تھا؟ آپؐ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ جناب  
امیر کی اس طاعت و جان نثاری کی بنا پر رسولؐ کی بارگاہ میں جو رسوخ ان کو  
حاصل تھا وہ دوسرے صحابہ کو گراں گزرتا تھا اور وہ اپنے جذبات سے مجبور ہو کر  
شکوہ و شکایت بھی کر گزرتے تھے۔

مسجد نبوی میں صحابہ کے مکانوں کے جو دروازے کھلتے تھے ان کے  
بند کر دئے جانے کا واقعہ طائف میں رسولؐ اور علیؑ کی رازدارانہ گفتگو کا حال  
بریدہ کا واقعہ، اور حجتہ الوداع سے قبل تمین سے واپسی کا واقعہ آپؐ نے ملاحظہ فرمایا  
ہوگا اور رسالتِ نبیؐ کی طرف سے جناب امیرؑ کے خلاف اعتراض یا شکوہ کا جو جواب  
منا تھا وہ بھی آپؐ نے پڑھ لیا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ نفسیات کے لحاظ سے یہ تمام واقعات  
اور زیادہ صحابہ کی برہمی کا باعث ہوئے ہوں گے۔ چنانچہ رسالتِ نبیؐ کو  
احساس تھا کہ جب میری زندگی میں یہ ہو رہا ہے تو بعد میں خدا جانے کیا  
ہو! احد میں صرف اتنی سنی افواہ ہو کہ رسولؐ اشرقتل ہو گئے سب کے قدم میدان  
سے اٹھ گئے اور زبانوں پر یہی تھا کہ پیغمبرؐ ہے تو اسلام کیا اور لڑائی

کیسی۔ آتش ہی نضر نے لوگوں سے پوچھا: تم ہاتھ پر ہاتھ دھرے کیوں بیٹھے ہو؟  
 جواب ملا کہ:۔ "رسولؐ تو ہیں نہیں پھر ہم کیا کریں؟" آتش نے کہا: رسولؐ  
 نہیں تو نہ سہی تم ان کے دین پر تو قائم ہوا اٹھو اور جہاد کرو" مگر بیٹھ نہ اٹھے  
 بیٹھے ہی رہے اور آتش نے جان دیدی۔ قرآن مجید کی جو آیتیں اس موقع سے  
 تعلق رکھتی ہیں غور سے پڑھنے کے قابل ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

ما محمد الا رسول وقد خلت من قبله الرسل افئن  
 مات او قتل انقلبتم على اعقابكم ومن ينقلب على عقبيه فلن  
 يضر الله شيئاً۔

محمدؐ نہیں ہیں مگر ایک رسولؐ جن کے پہلے بہت رسولؐ گزر چکے تو کیا  
 وہ مرجائیں یا قتل ہو جائیں تو تم اسلام سے ہٹ جاؤ گے اور جو شخص ایسا  
 کرے گا تو خدا کو اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔

اس کے علاوہ رسالتؐ نے اپنی بے اطمینانی کا جن الفاظ میں اظہار  
 کیا وہ کبھی گوشگزار ہو چکے ہیں جب آپؐ شہداء و اُحد کے متعلق فرمایا کہ میں  
 ان کا گواہ ہوں تو حضرت ابوبکرؓ نے کہا کیا ہم نے کبھی ان کی طرح جہاد نہیں کیا  
 یہ سنکر رسولؐ نے فرمایا: "ہاں مگر کسے خبر ہے تم لوگ میرے بعد کیا کرو؟"  
 دوسرے موقعوں پر حضرتؐ نے اس خطرہ کے وقوع کی صریح پیشین گوئی

کی ہے۔ بخاری کی حدیث ہے کہ:۔

”آنحضرت نے فرمایا میں تم سے پہلے حوض کوثر پر پہنچوں گا، کچھ لوگ تم سے  
میری طرف لائے جائیں گے اور جب میں جا ہوں گا کہ انہیں اپنے قریب  
بلاؤں تو وہ مجھ سے جدا کر دئے جائیں گے۔ میں کہوں گا خداوندایہ تو  
میرے اصحاب ہیں، ارشاد ہوگا تمہیں معلوم نہیں انہوں نے تمہارے بعد  
کیا کئے گئے۔“

آنحضرت کو جن چیزوں کے متعلق خطرہ تھا ان کو صاف طور پر حجۃ الوداع  
کے خطبہ میں ظاہر فرمایا جس کی اصل عبارت پہلے درج ہو چکی ہے، اس میں  
آنحضرت نے اس تنبیہ کے ساتھ کہ انا فرطکم علی الحوض رہیں حوض کوثر پر  
مقامہ پیش رو ہوں، یہ فرمایا ہے کہ میں تم میں دو چیزیں بہت گراں قدر چھوڑ  
جاتا ہوں، ایک کتاب خدا دوسرا نبی عترت و اہلبیت، دیکھو میرے  
بعد تم ان کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہو؟ اس طرح حضرت نے اس پہلی بیعت  
کے موقع پر جو ”اندر عشیرہ نکالائے بین“ کا حکم نافذ ہونے پر لگی تھی،  
علی کی وزارت و صایت و خلافت کا اعلان فرما دیا تھا۔ پھر اسکے بعد مختلف  
طرح سے علی کے کمالات کو روشن کیا، علمی حیثیت سے ”انما یرتہ العلم و علی بہا  
فرما کر یہ ثابت کیا کہ میرے علوم اگر دستیاب ہو سکتے ہیں تو صرف علی کے ذریعہ  
سے ”اقضاکم علی“ کہر فصل مقدمات کا بہترین ماہر بتایا۔ ”علی منی“ کہر



انتہائی بگاڑت و وابستگی کا اظہار فرمایا اور سب کے آخر میں غدیر خم کے میدان میں "من كنت مولاه فعلى مولاه" کہہ کر علی کی حکومت، ولایت و خلا کا صریح اعلان فرمادیا، یہاں تک کہ صحابہ نے علی کو مبارکباد بھی دی، لیکن کیا رسول اللہ کو اطمینان ہو گیا تھا؟ ہرگز نہیں، واقعات بتلاتے ہیں کہ آپ مطمئن نہ ہوئے تھے۔

حضرت اس خطبہ کے بعد غدیر خم سے روانہ ہو کر مدینہ پہنچے، محرم کے مہینہ بھر آپ اچھے رہے، صفر میں بیمار پڑے اور اس بیماری میں مبتلا ہو کر جو آپ کے لئے مرض الموت ثابت ہوئی، حضرت نے اس بیماری کی حالت میں تقریر کی اور فرمایا:-

اتھا الناس يومئذ ان اقبض قبضاً سريراً فينطلق بي وقد قدمت اليكم القول معذرة اليكم لا اني مخلف فيكم كتاب ربي وعترتي اهل بيتي (اے لوگو بہت قریب ہے، وہ وقت کہ میں دنیا سے اٹھ جاؤں اور تم سے رخصت ہوں۔ میں نے اس سے قبل تم سے سب کچھ کہہ دیا ہے۔ اور حجت تمام کر دی ہے۔ پس تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں تمہارے درمیان خدا کی کتاب اور انبی عترت المہبت کو چھوڑے جا رہا ہوں) یہ کہہ حضرت نے جناب امیر کا ہاتھ پکڑا اور اسے بلند کر کے فرمایا:-

هذا على مع القرآن والقرآن مع على لا يفترقان حتى يرثيا

علی الحوین فاستلھما ما خلفت فیھما رعلی قرآن کے ساتھ ہے اور قرآن علی کے ساتھ یہ دونوں جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ میرے پاس حوض کوثر پر پہنچیں میں ان سے دریافت کروں گا کہ تم نے ان سے میرے بعد کما سلوک کیا۔

اب مرض کی شدت اور زیادہ بڑھ گئی حضرت نے اسی عالم میں ایک علم اسامہ بن زید کے لئے تیار کیا اور تمام بڑے بڑے صحابہ کو اسامہ کی ماتحتی میں جنگ کے لئے روانگی کا حکم دیا۔ تاریخیں متفق ہیں کہ حضرت ابو بکر، حضرت عمر بھی اسامہ کے ساتھ جانے پر مامور ہوئے تھے۔

لوگوں کو بڑا ناگوار ہوا کہ رسالتکتاب نے اتنے بڑے بڑے صحابہ پر اسامہ بن زید کو حاکم بنا دیا حضرت کو معلوم ہوا تو آپ کو بہت غصہ آیا اور اسی حالت میں چادر اوڑھے، سر پر رومال باندھے باہر آگئے اور منبر پر جا کر فرمایا:-

”تم لوگ اسامہ کی امارت پر معترض ہو، یہ نئی بات نہیں ہے، اس سے

پہلے تم اس کے باپ (زید بن حارثہ) کی امارت پر بھی اعتراض کر چکے ہو

بخدا وہ امارت کے لائق تھا اور یہ اسکا بیٹا بھی امارت کے لائق ہے۔“

بیشک ان اشخاص میں جو ساتھ جانے پر مامور تھے حضرت علی کا نام نظر نہیں آتا

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے درایح النبوة میں تصریح کر دی ہے کہ:-

۱۔ صواعق محرقة مطبوعہ مصر صفحہ ۷۷۔ ۲۔ طبقات ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۱۳۶۔ مؤرخ

لدنیہ جلد ۱ صفحہ ۱۷۹۔ تاریخ خمیس جلد ۲ صفحہ ۱۷۱۔

”حکم عالی خیاں صادر شد کہ از اعیان مہاجر و انصار مثل ابو بکر صدیق ،  
 و عمر فاروق و عثمان ذی النورین و سعد بن ابی وقاص و ابو عبیدہ بن الجراح  
 و غیر ہم الا علی مرتضیٰ را کہ ہمراہ نہ کردوران لشکر ہمراہ اسامہ باشند“  
 واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اللہ کو اپنی زندگی کے آخر ہونے کا یقین تھا  
 وہ اپنی موت کی اطلاع رکھتے تھے اور اسکے لئے طیاریاں کر رہے تھے۔ اس موقع پر  
 حضرت کا خاص طور سے لشکر اسامہ کی روانگی کا حکم دیا اسی لئے تھا کہ وہ ان تمام  
 لوگوں کے وجود سے مدینہ کو خالی کر دینا چاہتے تھے۔

اگر آپ کا منشا کسی حیثیت سے یہ ہوتا کہ آپ کے بعد امور خلق کی ذمہ داری  
 ان اشخاص میں سے کسی کے سپرد ہو تو ظاہر ہے کہ وہ اپنے وقت آخر میں ان لوگوں  
 کو لشکر اسامہ کے ساتھ جانے کی تاکید نہ فرماتے۔ حضرت کو اس امر میں تناہتمام  
 تھا کہ شرت مرض میں جب آنکھ کھلتی تھی تو بار بار یہی تاکید فرماتے تھے کہ لشکر  
 فوراً روانہ ہو جائے۔ لوگ رسول خدا کے اس منشا کو سمجھتے تھے اور اسی لئے  
 تعمیل حکم میں پس و پیش ہو رہا تھا۔ لیکن اسامہ کا لشکر نہ جانا تھا نہ گیا اور  
 گیا اس وقت جب رسول اللہ کی وفات ہو چکی اور خلافت کا مسئلہ تکمیل کو  
 پہنچ گیا۔

اب رسالت کا مرض انتہائی شدت تک پہنچ گیا ہے، مگر اب بھی اگر کوئی  
 خیال آپ کو ہے تو صرف وہی ایک، کوئی اندیشہ ہے تو وہی ایک۔ ایک بار



غش سے آنکھ کھلتی ہے تو فرماتے ہیں "نوراد واٹ تلم ننگواؤیں تمھارے لئے  
ایک نوشتہ چھوڑ جاؤں تاکہ میرے بعد تم گمراہی میں نہ مبتلا ہو" مگر حضرت  
عمر نے انکار کر دیا، فرمایا کہ "پیغمبر پر مرض کا غلبہ ہے اور ہم کو کتاب خدا کافی  
ہے" صحیح بخاری میں متعدد روایتیں پائی جاتی ہیں۔ ایک روایت ابن  
عباس سے ہے کہ :-

"ابن عباس کہتے تھے۔ بائے پنجشنبہ کا دن، تم جانتے ہو کہ پنجشنبہ کے دن  
کیا ہوا۔ رسالتاب پر مرض کی شدت ہوئی، حضرت نے فرمایا لاؤ میں تمہیں  
ایک نوشتہ تحریر کر دوں تاکہ میرے بعد تم گمراہ نہ ہو، لوگوں نے اعتقاد شروع  
کیا اور کہا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، ذرا پھر پوچھو، لوگ آپ کے قریب گئے کہ  
پھر آپ دریافت کریں حضرت نے فرمایا "جاؤ چھوڑ دو مجھ کو، میں جس حال میں  
ہوں اسی حال میں رہنے دو"

دوسری روایت یہ ہے کہ :-

"جب رسالتاب کا آخر وقت تھا اس وقت گھر میں بہت سے آدمی موجود  
تھے حضرت نے فرمایا آؤ میں تمہیں ایک نوشتہ تحریر کر دوں تاکہ میرے بعد  
تم گمراہ نہ ہو ان میں سے بعض نے کہا کہ حضرت پر مرض کا غلبہ ہے اور تمہارا  
باس قرآن تو موجود ہی ہے نتیجہ یہ ہوا کہ اس وقت جو لوگ گھر میں موجود تھے

ان میں اختلاف شروع ہو گیا۔ کچھ لوگ کہتے تھے قلم دوات ویدو، کچھ اسکے مخالف تھے، جب بہت شور ہوا تو حضرت نے فرمایا کہ اٹھ جاؤ میرے پاس۔

ان دونوں روایتوں میں اختلاف کرنے والوں کا نام درج نہیں ہے، لیکن تیسری روایت سے یہ ابہام بھی دور ہو جاتا ہے اور ہمیں صاف صاف تحریر ہے کہ مخالفت کرنے والے حضرت عمرؓ تھے۔ ملاحظہ ہو بخاری باب قول المريض قوموا عنیؓ



رسالتاً کو اس واقعہ سے جتنا صدمہ بھی ہو چکا ہو کم ہے، چنانچہ آئی صدمہ کا نتیجہ تھا کہ آپؐ رہم ہو کر سب کو اپنے پاس سے ہٹا دیا۔ لیکن اس منظر کی ایک آخری کڑی اور ہے جو دیکھنے کے قابل ہے، اس داستان کا ایک ٹکڑا اور ہے جو سننے کے قابل ہے اور کیسی اور کے منہ کی بات نہیں ہے بلکہ خود جناب عائشہ کا بیان ہے۔

قالت قال رسول الله لما حضرته الوفاة ادعوا الى جيبى فدعوا له ابا بكر فنظر اليه ثم وضع رأسه، ثم قال ادعوا الى جيبى فدعوا له عمر فنظر اليه ثم وضع رأسه ثم قال ادعوا الى جيبى فدعوا له علياً فلما رآه ادخله معه في الثوب الذي كان عليه فلم يزل يحتضنه حتى قبض وبيده

علیہ اخرجہ الرازی -

حضرت عائشہ کی روایت ہے کہ جب حضرت کا بالکل وقت آخر تھا تو آپ نے فرمایا بلاؤ میرے حبیب کو، کوئی جا کر حضرت ابو بکر کو بلا لایا آپ نے تکبیر سے سر اٹھا کر دیکھا اور پھر تکبیر پر سر رکھ دیا، دوبارہ فرمایا بلاؤ میرے حبیب کو۔ اب جا کر حضرت عمر کو بلا لائے آپ نے ان کو بھی دیکھ کر تکبیر پر سر رکھ لیا، تیسری مرتبہ پھر آپ نے ہی فرمایا کسی نے علی کو بلا لیا۔ جب آپ نے علی کو دیکھا تو انھیں اپنی جاؤں میں لے لیا جس کو آپ اڑھے ہوئے تھے اور برابر اسی طرح لئے رہے یہاں تک کہ حضرت کی روح مبارک نے جسم سے پرواز کی تو آپ کا ہاتھ علی کے اوپر تھا۔

۔۔۔۔۔





## مسئلہ خلافت و امامت<sup>(۱)</sup>

”نگار“ مارچ ۱۹۳۵ء کی اشاعت میں ”خلافت و امامت کے عنوان سے ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس کو کسی ہندو اہل قلم جناب ”ہرنام“ کی کاوش و ماغی نتیجہ ظاہر کیا گیا ہے۔ اگرچہ اس طرح سے دیکھنے والے پر نبطا ہر یہ اثر پڑتا ہے کہ ایک بے تعلق غیر مسلم کے خیالات ہونے کی بنا پر بحث میں غیر جانبداری کے ساتھ خالص تحقیقی نقطہ نگاہ کو پیش نظر رکھا گیا ہوگا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ محترم موصوف باوجود ہندو ہونے کے ”شیعیت“ کے ساتھ جذباتی ہمدردی رکھتے ہیں۔ اور اس لحاظ سے گو نبطا ہرنام کا اسم گرامی ”ہرنام“ ہے لیکن شاید اپنی مضمون میں اس حقیقت کو چھپانے میں کامیاب نہ ہو سکے کہ دل کی گہرائیوں سے وہ حضرت علی کی امامت کو ایک مذہبی کے تمام جذباتی رنگ کیساتھ تسلیم کر چکے ہیں۔ تحریکِ رنگ قدم قدم پر ان کی اس شکست پر غامزی کرتا ہے۔ بالخصوص جہاں ان کا ”دل تھرتا ہے“ قلم لرزتا ہے جی جاتا ہے موزوں کے منہ پر ہاتھ رکھ دیں کس طرح دیکھیں اور کنوکر لکھیں کہ کس کس نے فرار کیا؟“ (صفحہ ۴۴)

بہر حال جو کچھ بھی ہو انکی تحقیقی کاوش کی داد نہ دنیا بڑی بے انصافی ہوگی  
 لیکن میں سمجھتا ہوں کہ شاید اس سبب پر قلم اٹھاتے وقت موسوف نے  
 واقعات پر فلسفہ تالیف کی روشنی میں نفسیاتی اعتبار سے کوئی نظر نہیں  
 ڈالی۔ نیز فلسفہ نبوت اور عام اخلاق انسانی کے فلسفہ کے پہلو سے بھی  
 اس سوال پر تفصیلی غور نہیں فرمایا۔ ممکن ہے کہ میری یہ حقیر کوشش  
 کسی حد تک حقیقت کے چہرہ کو بے نقاب کرنے میں مدد دے۔

افسوس ہے کہ میں یہاں تفصیل کے ساتھ مقالہ نگار کے استدلال کے ہر ہر  
 جز پر نظر نہیں ڈال سکتا۔ میں جو کچھ کروں گا وہ ایک ایسے مورخ کے  
 اجمالی تبصرہ کے مترادف ہوگا جو واقعات کو منطقی علل و استنتاج کے ساتھ  
 ساتھ دنیا کے عملی فلسفہ کی روشنی میں دیکھتا ہے۔ بہر حال میں مسلمان  
 ہوں اور پھر اہل سنت اسلئے میں حتی الوسع کوشش سرور کروں گا کہ اپنی  
 تحریر میں جذباتی رنگ نہ آنے دوں۔ لیکن پھر بھی کسی بے راہ روی کا  
 پہلے سے معذرت خواہ ہوں۔

”بزمی“

فلسفہ کے تمام عمیق مسائل طے ہو سکتے ہیں۔ ریاضی کے دقیق سے دقیق  
 نظریے حل کئے جاسکتے ہیں۔ نظام بطلیموسی کی جگہ نظام فیثا غورث لے سکتا ہے  
 نیوٹن کے نظریہ کی کشش کو انیشتین بدل کر رکھ سکتا ہے لیکن اگر ملحد نظری اور  
 بے لوث تحقیقی نگاہ سے ایک لمحہ کے لئے بھی اعراض کر لیا جائے تو نہ مسائل

ٹے ہو سکتے ہیں اور نہ مسلمانوں میں ساڑھے تیرہ سو برس گزر جانے کے باوجود خلافت و امامت کا مسئلہ سلجھ سکتا ہے۔

اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ نبی کریم کی سب سے بڑی حیثیت ایک اخلاقی مودب کی حیثیت ہے لیکن اسکے معنی ہرگز نہیں لئے جاسکتے کہ آپ کی اس حیثیت سے "سیاست ملکی" خارج ہے۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ دنیا میں عام طور پر اخلاقی درس دینے والے مصلحین کی زندگی میں سیاست بہت کم دخل ہوتی ہے لیکن رسول عربی کا مسئلہ ان سب سے جدا ہے آپ کی تعلیم کا کوئی جز و ہوت تک حقیقی معنی میں مکمل نہیں ہو سکتا۔ جب تک حکومت و سیاست کی اعانت اس کے ساتھ شامل نہ ہو۔

پھر یہ کوئی ایسی حقیقت نہیں ہے جس کو اہل سنت مسلمان تعصب کی بنا پر رکھتے ہوں۔ بلکہ یورپ کے بے تعلق مستشرقین بھی متفقہ طور پر اس رائے کی تائید کرتے ہیں۔ اگر گوئرز ہیر۔ فان کرمر۔ ٹولڈ کی۔ دی ساسی۔ کا ترمیر۔ مکلسن اور براؤن جیسے مسلمہ فاضل مصنفین کی تصانیف کا مطالعہ کیا جائے تو قدم قدم پر اس حقیقت کا علم ہوتا ہے کہ محمد کی تعلیمات میں "جرج" اور "اسٹیٹ" دو جدا جدا چیزیں نہیں ہیں۔

غور کیجئے اگر تنویری دیر کے لئے یہ بیان لیا جائے کہ نبی کریم سیاست بالکل علیحدہ رکھ کر اخلاقی تعلیم دینا چاہتے تھے تو پھر قرآن و حدیث کی ان



سینکڑوں ہدایات کی کیا تاویل کی جائے گی جن میں خالص سیاسی مسائل بیان  
کئے گئے ہیں۔ مثلاً جزیہ۔ ذمتی۔ حربی۔ جہاد۔ حد زنا و سرقہ وغیرہ وغیرہ۔  
الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت  
لکم الاسلام دیناً۔ (سورہ المائدہ آیت ۳) کی آیت فتح مکہ کے بعد نازل  
ہوئی۔ اگر نبی کریم کے معاشرتی اور اخلاقی صلاح کے پروگرام میں حکومت و سیاست  
داخل نہ ہوتی تو اس آیت میں "الیوم" کا مفہوم ہی کچھ باقی نہ رہتا۔ اس لئے کہ  
اگر فتح مکہ کے بعد سے نبی کریم کی سیاسی حیثیت کا مسلم ہو جانا آکے "درس"  
کی تکمیل میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا تو پھر "الیوم" کا لفظ بھی کچھ زیادہ بامعنی  
نہیں رہتا۔

میر اخلاقی اور معاشرتی صلاح (سوشل ریفارم) کو سیاست کے ساتھ ساتھ  
کھینے کا نظریہ کوئی ایسا نظریہ نہیں ہے جس کو عقل باور نہ کر سکے۔ دنیا کا بڑے  
سے بڑا صلح اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ معاشرتی صلاح اس وقت تک  
ناممکن ہے جب تک ملکی سیاست کے ارباب حل و عقد اس میں دشگیری و معاون  
نہ ہوں۔ گاندھی ہندوستان کا بلند ترین سیاسی رہبر سمجھا جاتا ہے لیکن وہ ایک  
دفعہ نہیں ہزار دفعہ اس حقیقت کو تقریروں اور تحریروں میں آشکارا کر چکا  
ہے کہ "میر حقیقی مشن معاشرتی اصلاح ہے۔ لیکن وہ اس وقت تک حاصل  
نہیں ہو سکتا جب تک کہ ہندوستان کی حکومت ہندوستانیوں کے ہاتھ میں ہو۔"

حقیقاً وہ لوگ اسلام کا صحیح مفہوم نہیں سمجھتے جو یہ کہتے ہیں کہ اسکو سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسلام صرف ریاضت کرنے یا گوشہ میں بیٹھ کر عبادت کرنے کا ایک نظام نہیں ہے۔ بلکہ اس کے برخلاف وہ ایک ایسا عمل پر وگرام ہے۔ جو انسان کو زندگی کے ہر شعبہ میں صحیح مسلک پر کار بند رکھنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مقصد کا صحیح حصول اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ ملکی نظام پر صحیح معنی میں پورا پورا اختیار نہ ہو۔

پھر اگر یہ باور بھی کر لیا جائے کہ نبی کریم کا مقصد سیاست سے بالکل علیحدہ تھا اور یہ بعد کی بدعت ہی تو پھر وہ جماعت جو حضرت علی کو نبی کریم کا صحیح جانشین قرار دیتی ہے۔ اسکا کیا جواب دے گی کہ خود حضرت علی نے بھی مسند خلافت پر متمکن ہونے کے بعد اس کے خلاف آواز بلند نہیں کی۔ بلکہ اس کے علی الرغم اپنی سیاسی اہمیت کے قیام و بقا کے لئے جنگ حمل میں آرائی کی۔ طلحہ وزیر کو قتل کرایا۔ معاویہ کے مقابلہ کے لئے میدان صفین میں پراؤ ڈالا۔ اور پھر نہروان میں تقریباً تین ہزار کلمہ گو اہل عرب کو تہ تیغ کرایا۔ میں پوچھتا ہوں کہ ان تمام مقتولین کے خلاف اگر "بغاوت" کا الزام تھا جو خالص سیاسی الزام ہے تو پھر حضرت علی کی پوزیشن جس درجہ نازک ہو جاتی ہے

۱۵ ملاحظہ ہو۔ الکامل للمبرور مطبوعہ مصر جلد سوم صفحہ ۱۰۵۔ فان کریم وغیرہ متشرفین پورے اس کتاب کو حضرت علی کی خلافت کے واقعات میں نہایت ہی مستند مرتبہ یا پر۔

وہ محتاج بیان نہیں۔ اگر ان کی حیثیت ایک "بڑے پیر" سے زیادہ نہ تھی تو ان کے مجتہد کی طرح انھوں نے ان مواقع پر صرف خاموشی کا اظہار کیوں نہ کیا؟ یا زیادہ سے زیادہ ان سے اپنی برائت کا اعلان کر کے خاموش کیوں نہ ہو گئے؟ بہر حال خلافت و امامت کے مسئلہ میں اگر بے تعصبی کے ساتھ ذرا سے غور سے بھی کام لیا جائے تو یہ حقیقت بے نقاب ہوے بغیر نہیں رہ سکتی کہ نبی کریم کا صحیح جانشین وہی ہو سکتا ہے جو ایک طرف تو اخلاقی فضیلت میں دنیا کا مکمل ترین انسان ہو اور دوسری طرف سیاسی صل و عقد میں دنیا کا مہذب ترین فرماں روا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ان دونوں حیثیتوں کے اعتبار سے صحابہ کرام کے گروہ میں سے نبی کریم کا صحیح جانشین کون ہو سکتا تھا اگرچہ دنیا کا عام اصول تو یہ ہے کہ جو شخص کسی عہدہ کو بغیر کسی قباحت کے انجام دے۔ اسے اس عہدہ کا اہل سمجھا جاتا ہے۔ اور اس لئے حضرت ابو بکر اور حضرت عمر کی اہلیت میں کوئی شک ہونا ہی نہ چاہیے۔ جبکہ دنیا کا ہر بلند نظر مورخ ان حضرات کی اخلاقی پاکیزگی سیاسی بلند نظری۔ اور عام معاشرتی رفعت و برتری کا بھی قائل ہے۔ لیکن یہاں پوچھ کر ہم کو جس پر خار وادی میں داخل ہونا پڑتا ہے وہ یہ ہے۔ "کیا نبی کریم حضرت علی کو اپنے بعد اپنا خلیفہ بنانا چاہتے تھے؟" حضرت علی ایک متقی زاہد اور فداکار صحابی ہونے کے علاوہ آپ کے

چہرے بھائی تھے۔ ابتدا سے آپ کے رفیق و معاون رہے۔ بعد میں داماد بھی  
 ہو چکے تھے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ نبی کریم نے مختلف اوقات میں مختلف حالات  
 سے متاثر ہو کر آپ کے اوصاف بیان فرمائے ہیں۔ لیکن اگر ان اوصاف فی الفاظ  
 کی منطقی اور لغوی تحلیل کر کے یہ نتیجہ نکالا جائے کہ نبی کریم آپ کو اپنا جانشین  
 بنانے کے خواہشمند تھے۔ تو منصب نبوت کو سمجھنے میں اس سے بڑھ کر اور کوئی  
 بنیادی غلطی نہیں ہو سکتی۔ غور تو کیجئے، جس شخص کو محمد عربی کے الہامی نبی  
 ہونے پر ایمان ہو وہ یہ سوال کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اگر فی الواقع آپ الہامی  
 طور پر حضرت علی کو اپنا خلیفہ بنانے پر مامور ہو چکے تھے تو پھر آپ نے علیؓ کو  
 الشہادہ اس کا اعلان کیوں نہ فرمایا؟ جو بے خوف اور ڈر بغیر اپنے عزم و  
 ثبات کے مقابلہ میں ساری دنیا کو چیلنج دیکتا ہے۔ اُن کے بتخانوں کو پکنا چور  
 کر سکتا ہے۔ شراب کے قراہوں کو توڑا کر پیچھا کر سکتا ہے۔ اہل عرب کے نسب و فخر  
 کو پاؤں کے نیچے کچل سکتا ہے۔ کیا اسکی ہر اخلاقی کمزوری کا کسی حیثیت سے  
 بھی اعتراف کیا جا سکتا ہے۔ کہ وہ بعض چند لوگوں کے ڈر سے اپنے جانشین  
 کا اعلان کرتے ہوئے ڈرتا ہے؟ ہر وہ شخص جس کو الہام اور وحی پر ایک سچا <sup>عقیدہ</sup>  
 مسلمان کی طرح عقیدہ ہو وہ یہ باور نہیں کر سکتا کہ دنیا دارانہ مصلحتوں کے تحت  
 ایک عظیم المرتبت نبی اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک "خلافت" جیسی عظیم حقیقت  
 کے اظہار سے جان چھڑاتا رہے؟



علاوہ ازیں اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ نبی کریم قدم قدم پر اشارہ اور بالواسطہ طور پر حضرت علی کو اپنا قائم مقام بنانے کی رہبری کرتے رہے تو اس سے رسولؐ کی پوزیشن جس درجہ نازک ہو جاتی ہے وہ زیادہ توضیح کی محتاج نہیں ہے۔ اگر ابو بکر اور عمر بلا کسی دنیوی نفع کے اور بلا کسی رشتہ قرابت و عزیزی کے صرف اس لئے رسولؐ پر جان دیتے ہیں کہ وہ خدا کی طرف سے بھیجا ہوا ایک سچا راہنما ہے۔ اور اپنی اس صداقت کے ثبوت میں اپنی حیات کے آخری سکون تک عشق رسولؐ کا دم بھرتے رہتے ہیں۔ اپنی نوجوان لخت جگر صاحبزادوں کو اس کے حوالہ از دواج میں دیدیتے ہیں۔ اس کے ایک ایک اشارہ پر کھیلنے کی طرح ناچتے ہیں۔ اسے حکم کے سامنے اپنی ساری دھن دولت ٹٹا دیتے ہیں۔ غرض کہ وہ سب کچھ کرتے ہیں جو ایک جان فروش کو کرنا چاہیے۔ لیکن اسکے باوجود بھی اگر وہ رسولؐ کی بارگاہ میں صرف اس لئے نظروں سے گزرے ہوئے ہیں کہ ان کے مقابلے میں رسولؐ کا چچرا بھائی اور اس کا داماد ہے۔

— تو پھر اسکا نام "منصفانہ عز و پستی"؟  
 نہیں تو اور کیا ہے؟ اور اگر اس کو بدترین قسم کی "بیرحمانہ جانبداری" اور غیر منصفانہ پاسداری "نہیں کہہ سکتے تو اور کیا کہیں گے؟  
 لیکن تاریخ اسلامی کا ہر اسٹوڈنٹ جانتا ہے کہ نبی کریم کی ذات گرامی اس قسم کی تنگ نظریوں سے بہت بلند ہے۔

اب ہم بحث کے اس رخ کی طرف آئے ہیں۔ جہاں یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ  
 "حضرت علی تمام صحابہ سے زیادہ خلافت کے مستحق تھے" اس حقیقت کو بے شک  
 تحقیقی نگاہ سے جانچنے کے لئے ایک بہترین طریقہ تو یہ ہو سکتا ہے کہ یہ  
 دیکھا جائے کہ مستشرقین یورپ ان کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں۔ ہم یہاں  
 صرف انگلینڈ کے الفاظ کو نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جو تقریباً تمام ذی رتبہ  
 مستشرقین کی آرا کی طرف سے نائیدگی کر سکتے ہیں:-

"حضرت علی میں حکمراں ہونے کے علاوہ اور تمام صفات موجود تھیں"۔  
 اسکے بعد ہمارے سامنے جو چیز ابو بکر و عمر کے مقابلہ میں حضرت علی کے  
 شرف و فضیلت کا صحیح معیار پیش کر سکتی ہے وہ ان دونوں کے عہد خلافت  
 کا مقابلہ ہے۔

خلفاء کی زندگی کا یہ پہلو اگرچہ ہماری بحث کا فیصلہ کن جواب ہونا چاہیے  
 تھا لیکن ہمیں افسوس ہے کہ چونکہ یہ مقابلہ بے انتہا غیر مبہم اور واضح ہے  
 اسلئے "مؤیدین امامت" نے اس میدان میں اپنی شکست کو یقینی سمجھتے  
 ہوئے اپنی رزمگاہ کے دو اور میدان تلاش کئے ہیں۔ یعنی ایک تو یہی کہ  
 آیا خلافت کے مفہوم میں سیاست داخل ہے یا نہیں۔ اور دوسرے یہ کہ  
 نبی کریم کے اقوال سے حضرت علی کی بے انتہا فضیلت ثابت ہوتی ہے۔  
 لیکن چونکہ پہلے مسئلہ پر ایک جانی تبصرہ کیا جا چکا ہے اسلئے ہمارے سامنے

صرف دوسرا سوال باقی رہ جاتا ہے۔ یعنی یہ کہ خود نبی کریم کے اقوال سے حضرت عمرو ابو بکر کے مقابلہ میں حضرت علی کی کیا فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں "مؤیدین امامت"۔ "انامدینۃ العلم وعلی باجہا" کی حدیث کو نہایت شدت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ لیکن اس کے مقابلہ میں حضرت عمر کے متعلق صحیح بخاری کی ان احادیث کو ملاحظہ فرمایا جاوے۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ خواب میں میرے سامنے کچھ لوگ پیش کئے گئے جو کرتے پہنے ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی کا کرتہ سینہ تک تھا کسی کا اسکے نیچے۔ پھر عمر میرے سامنے لائے گئے ان کا کرتہ اتنا لمبا تھا کہ اس کا دامن زمین پر گھسٹتا جاتا تھا لوگوں

پوچھا "اس کی تعبیر؟" آپ نے فرمایا: "عمر کی دینداری"۔

اسی قسم کی ایک دوسری حدیث ہے جس میں آپ نے خواب میں ایک گلاس سے کچھ دودھ پیا۔ اور باقی حضرت عمر کو دیدیا۔ اور لوگوں کو اس کی تعبیر "علم" بتلائی۔

حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اس سے پہلے نبی اسرائیل میں ایسے لوگ گزر چکے ہیں جو اگرچہ پیغمبر نہ تھے لیکن ان پر خدا کی جانب سے الہام ہوتا تھا۔ اگر میری امت میں سے کسی شخص کو

۱۔ صحیح بخاری۔ کتاب الایمان ۲۔ صحیح بخاری۔ کتاب العلم۔

یہ مرتبہ حاصل ہے تو وہ عمر میں ہے۔

حضرت ابن عباس سے مروی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر کی وفات کے وقت حضرت علی کو یہ کہتے سنا ہے کہ ”مجھے یقین تھا کہ خدا تجھ کو تیرے دونوں ساتھیوں (رسول کریم و ابوبکر صدیق) کے ساتھ رکھے گا۔ کیونکہ میں نے اکثر نبی کریم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے، کنت انا و ابوبکر و عمر“ و فعلت انا و ابوبکر و عمر“ و ”انطلقت انا و ابوبکر و عمر“۔  
مکن ہے کہ پہلی حدیث کو محض اس لئے زیادہ قابل وثوق نہ سمجھا جائے کہ وہ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے بلکہ دوسری حدیث کے ردائے کو تو یقیناً اس سے بلند ہونا چاہیے۔

اس سلسلہ میں بخاری کی وہ حدیث بھی قابل تذکرہ ہے جس میں رسول کریم سے ایک عورت نے پوچھا ہے ”آپ کے بعد میں مسائل کس سے پوچھوں گی“ آپ نے فرمایا ”ابوبکر سے“۔

ایک موقع پر رسول کریم نے حضرت علی کے متعلق یہ فرمایا تھا ”علی دنیا اور آخرت میں میرا بھائی ہے“ اس سے یہ استدلال نہیں کیا جاسکتا کہ نبی اس طرح آپ کو اپنا جانشین بنا رہے تھے۔ حضرت علی واقعہً آپ کے بھائی تھے۔ اور اس لئے یہ بالکل بیاہی ہے جیسے آپ کہتے ”آمنہ دنیا اور

۱۵ صحیح بخاری کتاب فضائل صحابہ النبۃ ۱۵ صحیح بخاری کتاب فضائل صحابہ النبۃ



آخرت میں میری ماں ہیں۔ یا "عبداللہ دنیا اور آخرت میں میرے باپ ہیں۔"  
حضرت ابوبکر کی جاں نثارانہ اور فداکارانہ جذبہ کی ایک بہت بڑی  
مثال ان کا وہ کارنامہ ہے جن کے متعلق قرآن میں مذکور ہے :-

ثانی اثنین اذہما فی الغار یقول لصاحبہ لا تحزن  
ان اللہ معنا۔

یہ آیت غیر مشتبہ طور پر حضرت ابوبکر کی منقبت کو ظاہر کرتی ہے۔ اگر  
کچھ بحثی کے ساتھ تاویل بعید کو کام میں نہ لایا جائے تو اس کے معنی میں کوئی  
اشکال نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ "خدا بخش لائبریری ٹینہ" میں قرآن کا ایک  
قلمی نسخہ ہے جس پر گو کا تب کا نام درج نہیں ہے لیکن کسی شیعہ کی کوشش کا  
نتیجہ ہے۔ اس میں دو سورتیں زیادہ ہیں جن میں سے ایک کا نام "نورین"  
ہے اور دوسری کا نام "ولایت" نیز ۳۳ آیات بھی حسب ضرورت بڑھادی  
گئی ہیں۔ ان سورتوں اور آیات کو قرآن میں بڑھا دینے کے بعد "مصنف"  
نے شیعیت کے تمام مشتبہ مسائل کو قرآن میں داخل کر دیا ہے اور اسل ضافہ کے  
متعلق یہ خیال کیا گیا ہے کہ چونکہ قرآن کے یہ حصے اہل تشیع کی صریح حمایت  
میں تھے اس لئے اہل سنت نے ان کو اصل قرآن سے نکال دیا۔ (نعموذاشہر)  
بہر حال اس قرآن میں مذکورہ بالا آیت کے مفہوم کو حضرت ابوبکر کی خدمت میں  
تبدیل کرنے کی خاطر اس طرح لکھا گیا ہے :-

”بقول لصاحبه، وحيث لا تحزن ان الله معنا“

ڈوبتا آدمی تنکے کے سہارے کو غنیمت سمجھتا ہے۔ چنانچہ بعض اوقات حضرت علی کی امامت کو ثابت کرنے کے لئے اُن کے سابق الاسلام ہونے کو پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن اول تو یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے۔ تاہم اگر مختلف مستند اقوال کو یکجا جمع کرنے سے کوئی یقینی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے۔ تو وہ صرف یہ ہے کہ آپ نوجوانوں میں سب سے پہلے مسلمان تھے۔

بہر حال اگر اس بات کو مان بھی لیا جائے کہ آپ سب سے پہلے ہی اسلام لائے تب بھی یہ امر اتنی اہمیت نہیں رکھتا کہ محض اس کی وجہ سے آپ کو دیگر نام صحابہ سے افضل قرار دیدیا جائے۔ اس لئے کہ گو اس میں اختلاف ہے کہ اسلام لانے کے وقت آپ کی عمر کیا تھی۔ لیکن جس روایت میں سب سے زیادہ عمر بتلائی گئی ہے وہ سولہ برس ہے۔ اگر اسی روایت کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تب بھی یہ عمر وہ ہے جب انسان میں عقل و شعور کا آغاز ہوتا ہے۔ اس عمر میں انسانی دماغ غیر سچہ ہوتا ہے۔ اور بہت جلد ہی باتوں پر یقین کر لیتا ہے اور اس لئے اگرچہ حضرت علی کی نامہ ہی رفعت شان اور جلالت و مرتبت کا کسی مسلمان کو شبہ نہیں ہو سکتا لیکن مقابلہ اُن کے اسلام کو حضرت ابو بکر و حضرت عمر حبیبہ سچہ کار شرفائے قریش کے اسلام کے مقابلہ میں زیادہ قابل اہمیت بھی قرار نہیں دیا جاسکتا۔

اسکے علاوہ دوسرا سبب جس کی بنا پر ان کی یہ مسابقت فی الاسلام مقابلہ  
 اتنی اہم نہیں رہتی جتنی بیان کی جاتی ہے۔ یہ ہے کہ وہ رسول کریم کے چچ پر  
 بھائی تھے۔ اور اس لئے ظاہر ہے کہ ان کی اس "مسابقت ایمانی" میں  
 قریبی عزیز ہونے کی وجہ سے "وصول الی الحق" کا وہ بے لوث جذبہ فرما  
 نہیں ہو سکتا جو ابو بکر و عمر حبیبیہ غیر متعلق اشخاص میں پایا جاسکتا ہے۔  
 علاوہ ازیں رسول اکے بھائی ہونے کی وجہ سے قدرتی طور پر رسول کا  
 پیغام سب سے پہلے آپ کے کانوں تک پہنچا ہوگا۔ پھر اس کو حسن اتفاق کی  
 مثال کہیں تو کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اس میں فخر کی کوئی بات نہیں۔ فخر  
 البتہ یہ ہے کہ رسول کا پیغام سننے ہی فوراً "آمینا" کہہ دیا جائے۔ حقیقتاً حضرت  
 علیؑ کو یہ فخر ہو چکا ہے لیکن اس میں حضرت ابو بکرؓ بھی برابر کے شریک ہیں۔  
 ابتدائے اسلام میں ایک مرتبہ نبی کریم نے اپنے اعزاء کے سامنے  
 اسلام کو پیش کرتے ہوئے حضرت علی کے متعلق کہا تھا :-

"ان هذا اخي ووصي وخليفة فيكم"

لیکن اس سے خلافت علی پر استدلال کیا جانا کسی صورت سے صحیح نہیں  
 ہو سکتا۔ اس وقت رسول کریم کی پوزیشن ایک بے یار و مددگار "لیڈر" سے  
 زیادہ نہ تھی۔ اور اس لئے ان جملوں سے اس موقع کے لحاظ سے جو کچھ  
 مراد لی جاسکتی ہے وہ اس سے زیادہ نہ ہونا چاہیے کہ حضرت علی کی حوصلہ

افزائی کے ساتھ ساتھ ان کو اس حالت میں نبی کریم کا واحد معتمد علیہ قرار دیا گیا ہے۔

پھر جو طبقہ حضرت علی کی الوہی امامت کا قائل ہے وہ اسی طرح حضرت حسن کی الوہی امامت کو بھی مانتا ہے۔ اگر اس عقیدہ کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو پھر میں پوچھتا ہوں کہ امام حسن کے اس "انتقام" کو سامنے رکھتے ہوئے جو آپ نے حضرت علی کے قاتل ابن ملجم سے لیا۔ ان کی اخلاقی فضیلت کا کیا معیار قائم کیا جائیگا؟

میں اس سلسلہ میں زیادہ تفصیلی بحث کرنا نہیں چاہتا لیکن اتنا اور کہہ دینا چاہتا ہوں کہ "شیعیت" کی جانب سے حضرت علی کی الہامی امامت کو ثابت کرنے کے لئے جتنے دلائل پیش کئے جاتے ہیں وہ حقیقتاً اسلام کے بنیادی اصول سے کوئی دور کا تعلق بھی نہیں رکھتے۔ اس جھگڑے کا آغاز محض بعض مقامی پیچیدگیوں سے ہوا تھا۔ جن کو اس وقت کامیاب بنانے کی خاطر مذہبی رنگ دیا گیا۔ اور جن کو اب غلطی سے مستقل مذہبی عقائد میں داخل کر لیا گیا ہے۔

عربوں کی فطری خاندانی عصبیت کے ماتحت نبی کریم کی وفات کے بعد بنو ہاشم کے ہر فرد نے اپنے موروثی جذبہ کے ماتحت اپنے خاندان کے ایک



منازہ فرو کو خلافت کا مستحق سمجھا اور اس کے لئے اُنھوں نے حضرت علیؑ کا نام پیش کیا۔ اس میں اُن کو ناکامی ہوئی۔ پھر خلافت راشدہ کے ختم ہوتے ہی بدقسمتی سے حضرت معاویہ نے جس سلطنت کی بنیادیں دمشق میں استوار کیں وہ خالص "بدوانہ" ذہنیت رکھتی تھی۔

ایران ہمیشہ سے ایک بلند اور مہذب حکومت رہی ہے۔ جنھوں نے ہمیشہ عربوں کو اپنے سے فروتر سمجھا ہے لیکن جب اسلامی فتوحات نے ایران کو دمشق کے پایہ تخت سے متعلق کر دیا۔ تو اہل ایران کی غیرت قومی اور حب الوطنی کے لئے یہ چیز سخت ناقابل برداشت تھی کہ وہ عربوں کے جوہر استبداد کے سامنے اپنی گردنوں کو خم ہوتا دیکھیں۔ گو وہ زمانہ کی ناسازگاری کے ہاتھوں اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو واپس نہیں لے سکتے تھے۔ لیکن اپنے جذبات کے ماتحت عربوں سے انتقام لینے کے معمولی سے معمولی موقعہ کے منتظر تھے۔ اسلام نے خلافت کے مسئلہ میں جس بلند معیار کو قائم کر دیا تھا وہ

اس سلسلہ میں فردوسی کے مندرجہ ذیل شعار ملاحظہ فرمائیے جو بتلاتے ہیں کہ راسخ عقیدہ مسلمان ہونے کے باوجود جب قومی اور ملی جذبہ کے ماتحت وہ ایرانیوں کے مقابلہ میں عربوں کو

ذکر کرتا ہے تو کتنا "پر شور" نظر آتا ہے۔

ز شیر خور دین و سوسمار	عرب را بجائے رسید ہست کار
کہ تخت کیاں را کنند آرزو	تقو بر تو لے چرخ گرداں نفو

اگر چالیسویں صدی ہجری میں حضرت علی کی شہادت کے بعد معاویہ کے بیرحم  
 ہاتھوں سے تباہ نہ ہو چکا تھا تو وہ وقت کی ضروریات کے ماتحت مختلف  
 ارتقائی دوروں سے گزرنے کے بعد آج دنیا کی اعلیٰ سے اعلیٰ جمہوریت کیلئے  
 بھی قابل رشک ہوتا۔ لیکن خلافت کے مسئلہ میں اس "انتخابی نظام"  
 سے دنیا قریب قریب ناواقف تھی۔ ایران میں "وراثت" کا قانون نافذ  
 تھا۔ انھوں نے عربوں سے بدلہ لینے کا بہت اچھا موقعہ دیکھا۔ کہ حضرت  
 علی کی الہامی نبوت کی آڑ میں خاندان اموی کے خلاف پروپیگنڈا شروع  
 کر دیں۔ چنانچہ بالآخر ۹۔ جون ۶۶۱ء کی صبح کو خراسان کے ایک گوشہ سے  
 ابو مسلم نے عباسیوں کا سیاہ جھنڈا بلند کر دیا۔ اور گو عباسیوں کے دور حکومت  
 میں ایران پوری طرح مطمئن نہ ہو سکا۔ لیکن جب چنگیز خاں کے حملہ کے  
 بعد ایران میں ایک مستقل خود مختار حکومت کی بنیاد قائم ہوئی تو ایرانوں کو بل کے  
 پھپھو لے پھوڑنے کا کافی موقع ملا۔ چنانچہ خاندان صفویہ اٹھا اور اس نے  
 صبح معنوں میں عربوں سے اس طرح انتقام لیا کہ سارے ملک کو  
 بنوک شمشیر شیعیت کے رنگ میں رنگ دیا۔

یہی حال عبداللہ ابن مہمون القدری کی اس عظیم الشان تاریخی سازش  
 کا ہے جس کے بعد مصر میں تقریباً دو سو برس تک بنو فاطمہ کے جھنڈوں کے  
 نیچے شیعیت پرورش پاتی رہی۔

المختصر ان واقعات کی روشنی میں یہ حقیقت محتاج تشریح نہیں  
 رہتی کہ خلافت و امامت کا مسئلہ نہ تو کوئی ایسا مسئلہ ہے جو آج درجہ  
 اعتنا کہا جاسکے، اور نہ "شیعیت" اسلام کا کوئی مذہبی فرقہ۔ فقط

سید ابوسعید بزمی بھوپالی۔ بی۔ اے



(۴)

## مسئلہ خلافت

(میر نام کے قتل سے)

مجھے یہ توقع ہرگز نہ تھی کہ میرے اس خالص سلیبے ہوئے مضمون کے جواب میں جو "خلافت و امامت" کے عنوان سے "نگار" میں شائع ہوا تھا مضمون لکھا صحابہ میری "شخصیت" کے متعلق بھی زور تسلیم ضرور صرف کریں گے۔ کوئی کچھ سمجھے۔ مجھے واقعی ہندو سمجھے اور یہ اور کیسے کہ مجھے صرف بعض شیعہ احباب کی صحبت اور مطالعہ کرتے شیعی ذریعے کے متعلق معلومات حاصل ہوئے اور میں نے محض ذوق تحقیق کی بنا پر کتابوں میں اس کے بارے میں جاننا ہی کی اور غیر جانبدارانہ تصفیہ کی کوشش کی یا یہی خیال کر لے کہ میں شیعہ ہوں اس کا اصل حقیقت مسئلہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

بے شک یہ اندازہ کر کے مجھے افسوس ہوا کہ مسلمانوں میں اب ذوق تحقیق اتنا گم ہو گیا ہے اور نظریں سطحی پہلوؤں کو دیکھنے کی اتنی عادی ہو گئی ہیں کہ باوجود ہمارے اخباروں اور رسالوں میں میرے مضمون کے متعلق غلط فہم بنند ہو جانے کے کوئی ایک مضمون بھی ایسا شائع نہیں ہوا جس میں میرے مضمون کے تمام جزئیات پر نظر ڈال کر تحقیقی حیثیت سے ان کے جواب



دینے کی کوشش کی گئی ہوتی۔

”نگار“ مارچ ۳۵ء میں میرا مضمون شائع ہوا۔ اس کے پورے چار ہفتے کے بعد جولائی کے پہلے میں میرے ناوید کر مفر سید ابو سعید بزمی صاحب بھوپالی بی اے کا مضمون شائع ہوا جس کے ذیل میں حضرت مدظلہ کا یہ نوٹ قابل لحاظ تھا کہ ”ہر نام کے مضمون کا جواب متعدد حضرات نے بھیجا ہے ان موصولہ مضامین میں ہم سب سے پہلے جناب بزمی بی اے کا مضمون شائع کرتے ہیں۔ اس کے بعد ہم اور مضامین بھی شائع کریں گے۔“

اس کے بعد قدرتا مجھے انتظار پیدا ہونا چاہیے تھا اور یقیناً جواب کے لئے مجھے اُس وقت تک قلم اٹھانے کا حق نہیں تھا جب تک میرے مخالف مضامین کا سلسلہ ختم نہ ہو۔

لیکن افسوس ہے کہ اُس کے بعد نگار کے دو پہرے نکلے اور وہ بالکل اس بحث سے خالی ہیں۔ جناب نیاز کی وسیع انخیالی سے یہ یقین ہوتا ہے کہ اگر دوسرے مضامین اُن کے معیار ذوق کے مطابق ہوتے تو وہ ضرور شائع کرتے، بہر حال اب میرا محور نظر صرف جناب بزمی کا مضمون ہے اس لئے کہ نگار کے سبب بحث پر سوائے اُنکے کوئی نہیں آیا ہے۔

پہلی بات جسے محل بحث قرار دیا گیا ہے اسلام میں "تعلیم اخلاق" اور سیاست  
 "ملکی" کا باہمی تعلق ہے۔ سجانے میری کس لفظ سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ میں پیغمبر اسلام  
 کی زندگی سے "سیاست ملک" کو بالکل علیحدہ کر دینا چاہتا ہوں یا میں اسلام  
 کو صرف ریاضت کرنے اور گوشہ میں بیٹھ کر عبادت کرنے کا ایک نظام قرار  
 دینا چاہتا ہوں؟

میرے الفاظ غور سے دیکھے نہیں گئے کہ اگر رسول کی حیثیت صرف  
 ایک بادشاہ کی شئی تھی بلکہ معلم روحانی ہونے کی خصوصیت بھی آپ میں پائی جاتی  
 تو ہم کو دیکھنا چاہیے کہ اس باب میں افضلیت کس کو حاصل تھی؟  
 اس "صرف" اور "بھی" کے نظر انداز کر دینے سے نقاد کے قلم کو دو صفحے  
 نذر تحریر کرنا پڑے۔ پورے مستشرقین خانہ شہادت میں الگ بلائے گئے  
 جزیرہ۔ ذمی جوبی، جہاد حد زنا و سرقت وغیرہ کے ہدایت قرآنی کی دتاویں  
 الگ پیش کر دی گئیں اور اخلاق و سیاست کے باہمی ارتباط کی عقلی بحث  
 الگ چھیڑ دی گئی۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں شیعہ اصحاب بھی ان دونوں کو الگ الگ نہیں  
 سمجھتے ہیں یعنی امامت کے حقوق کو صرف تعلیم اخلاق اور روحانی تربیت میں  
 منحصر نہیں سمجھتے بلکہ سلطنت کو اس کا لازمی جزو سمجھتے ہیں اور انہیں خلفائے  
 بنی امیہ و بنی عباس وغیرہ سے شکایت کیوں پیدا ہوتی کہ انہوں نے

صاحبان حقوق کے حق پر ناجائز قبضہ کر لیا۔ کیونکہ وہ چیز جس پر قبضہ کیا گیا  
سلطنت تھی۔ رہ گئی تعلیم روحانی اور ہدایت باطنی وہی کے غضب کرنے  
کی چیز نہیں اور نہ اس پر کوئی ناجائز قبضہ کر سکتا ہے۔

لیکن اس کے ساتھ کچھ بھی جہاں تک میں نے تاریخ اسلامی اور فلسفہ  
احکام اسلام کا مطالعہ کیا ہے میں اپنے ان الفاظ کا اعادہ کروں گا کہ "انخت  
کی حیثیت ایک دنیاوی بادشاہ کی سی نہ تھی۔ آپ کا نصب العین کسی سلطنت کی  
بنیاد رکھنا نہیں تھا بلکہ ایک قوم بنا رہے تھے جو انسانیت و اخلاق کے جوہر  
آراستہ ہو۔ بظاہر یہی الفاظ شش و پنج میں ڈالنے والے ہیں تو سنئے۔

"دنیاوی بادشاہت" میں اسے سمجھتا ہوں کہ جس کا مقصد اصلی صرف  
مادی اقتدار کا بڑھانا۔ اس پاس کے مالک پر فوج کشی کرنا اور حدود مملکت  
کا وسیع کرنا کمزور اقوام کو مغلوب کرنا اور انہی طاقت کا سکڑ بٹھانا۔ مال و دولت  
سے سرکاری خزانہ کو بھرنا اور سرمایہ میں اضافہ کرنا ہوتا ہے۔  
اس بادشاہت کی پوری کامیابی کا معیار صرف سطوت و اقتدار کی زاری

توسیع حدود و سلطنت اور جاہ و حشمت کی فراوانی میں منحصر ہوتا ہے۔ جہاں  
نہ حق اور ناحق کا سوال ہے۔ نہ عدل و انصاف کی شرط ہے۔ نہ اخلاق  
و آداب کی کوئی مراعات ہے۔

اس کا معیار تفوق صرف جہانگیری وہاں بانی ہے اور کچھ نہیں۔

اس کے برخلاف "روحانی حکومت" جس کے نظام و قانون کو میں سیاست  
 آئی کا مصداق سمجھتا ہوں وہ ہے جس میں ضروریات اجتماعی - لوازم تمدنی -  
 انتظامات ملی سب بلند و اخلاق اور صحیح انسانیت کے سایہ میں انجام پائیں  
 و ان کے لئے وسیع حدود مملکت کا ہو بلکہ قوم بنائی جا رہی ہو انسانیت  
 اخلاق کے جوہر سے آراستہ۔ بے شک قوم کی تشکیل بغیر "قوانین اجتماعی" کے  
 ہوتی ہی نہیں اور انہیں قوانین اجتماعی کا نام "نظام سیاسی" ہے لیکن یہ "سیاست"  
 اس سیاست سے بالکل مختلف ہوتی ہے جو سلاطین دنیا کے پیش نظر ہوتی ہے۔  
 یہ سیاست وہ ہے جو سی طرح تربیت اخلاقی سے علاحدہ جا رہی نہیں کہتی  
 اور بالکل لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتی ہے۔

پیشہ اصحاب کی تنگ نظری سمجھنے یا بارگاہ رسالت میں حد سے زیادہ  
 خوش تنقادی یا جو کچھ کہ ان کے خیال میں حضرت پیغمبر جس طرح اپنے زمانہ کے  
 غویہ ترین مسیح الفردی و اجتماعی تھے اپنے مخصوصین میں وہی سمجھ سکتے  
 تھے کہ اس روح اسلامی کی حفاظت کے ساتھ جو اس کا اصلی طرہ امتیاز ہے  
 تمدنی و اجتماعی انتظامات کو کون درست کر سکتا ہے۔



انہیں دیا کہ اس عام اصول میں کچھ تردد نہیں ہے کہ جو شخص کسی عہدہ کو بغیر کسی قباحت کے انجام دے اُسے اس عہدہ کا اہل سمجھا جاتا ہے لیکن اُنکا خیال یہ ہے کہ دنیا نے اس عہدہ کے سمجھنے میں غلطی کی اس لئے انجام دینے نہ دینے کی حقیقت میں بھی دھوکا ہوا۔

اُن کا مستقل خیال یہ ہے کہ پیغمبر اسلام کے بعد جتنی بھی حکومتیں قائم ہوئیں اُن میں توسیع ممالک، فتوحات، جاہ و شہرت کی فراوانی اور خزانہ و سرمایہ منگی میں ترقی جتنی بھی ہوئی ہو لیکن اسلامی تعلیمات کی روح فنا ہو گئی اور وہ باقی نہیں رہی۔

یعنی پیغمبری کی سنت کے بجائے کسروی و قبصری سنتیں قائم ہو گئیں اور اس لئے وہ ہرگز ہرگز ان حکومتوں کے دور کو کامیاب ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

حضرت علی کے مختصر دور حکومت کے ظاہری حیثیت سے کامیاب رہنے کا پورا سبب یہ قرار دیتے ہیں کہ آپ بالکل اُسی سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے جو حضرت کی تعلیمات سے بالکل متحد تھا اور اس لئے آپ جماعت ملی و تمدنی میں کلیتہً اُسی نظام کو بروئے کار لانا چاہتے تھے جو حضرت پیغمبر کا اصلی منشا تھا مگر امت اسلامیہ کے عام افراد کی کچس بہس کی طولانی مدت میں بالکل عادتیں

خصلتیں تبدیل ہو چکی تھیں۔ آپ کے دور کی پوری کامیابی اسی وقت کھل سکتی تھی جب آپ کی حکومت حضرت رسول اکرم کے بعد بلا فاصلہ تسلیم کر لی جاتی اور آپ پر اقتدار ہو جاتے۔

پھر بھی اس حیثیت سے آپ کا دور انتہائی کامیاب ہے کہ اتنی مختصر مدت میں بھی آپ نے دنیا کے سامنے یہ نمونہ پیش کر دیا کہ دنیاوی سلطنت والے بادشاہوں اور روحانی حکومت کے تاجداروں میں کیا فرق ہے اور ”سیاست مملوکیہ“ و ”سیاست نبویہ“ میں کتنا فرق ہے۔



یہ کہنا کہ حضرت علیؑ ایک متقی زاہد اور فداکار صحابی ہونے کے علاوہ نبی کریم کے چچرے بھائی تھے۔ ابتدا سے آپ کے رفیق و معاون رہے بعد میں داماد بھی ہو چکے تھے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ نبی کریم نے مختلف اوقات میں مختلف حالات سے متاثر ہو کر آپ کے اوصاف بیان فرمائے ہیں۔

اس کے متعلق یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو چند صفیں حضرت علیؑ کی شمار کر لی گئی ہیں ان میں سے ”متقی“ اور ”زاہد“ اور ”فداکار“ اور ”صحابی“ اور ”رفیق و معاون“ کی صفوں میں تو جمہور اسلام دوسرے صحابہ کو حضرت علیؑ کا ہم تسلیم یا آپ کے چند قدم آگے قرار دیتے ہوئے ہے۔ پھر اب یہ کیا جاتا ہے۔ چچرے بھائی اور داماد ہونا۔ چچرے بھائی ہونے کی صفت میں بھی عقیدل و

جعفر شریک تھے اور داماد ہونے میں بقول مورخین اہلسنت حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ تھے۔ پھر آخر مختلف اوقات میں مختلف حالات سے متاثر ہو کر حضرت علیؑ ہی کے متعلق آنحضرتؐ نے اُن اوصاف کا کیوں تذکرہ کیا۔ دوسرے صحابہ کے متعلق اُس طرح کے اوصاف کیوں ذکر نہیں فرمائے۔

اسکے علاوہ کیا پیغمبر اسلام صرف جذباتی انسان تھے کہ فقط اپنے

چھپرے بھائی اور داماد ہونے کی وجہ سے وہ تعریفیں کرنا شروع کر دیں۔ حالانکہ دوسرے صحابہ اُن اوصاف میں اُن سے بدرجہا بڑھے ہوئے ہوں۔

اگر حضرت ابو بکر اور حضرت عمر بلا کسی دنیوی نفع کے اور بلا کسی رشتہ

قربت و عزیزی داری کے صرف اس لئے رسول پر جان دیتے ہیں کہ وہ خدا کی

طرف سے بھیجا ہوا ایک سچا لہجہ ہے۔ اور اپنی اس صداقت کے ثبوت میں اپنی

حیات کے آخری سکون تک عشق رسول کا دم بھرتے رہتے ہیں۔ اپنی نوجوان

لخت جگر صاحبزادیوں کو اُس کے حوالہ از دلج میں دیتے ہیں بقول

ہزقی صاحب، اُس کے ایک ایک اشارہ پر کٹھ تیلیوں کی طرح تپتے ہیں۔

اسکے حکم کے سامنے اپنی ساری دین و دولت لٹا دیتے ہیں۔ غرض کہ وہ سب کچھ

کرتے ہیں جو ایک جان فروش کو کرنا چاہیے لیکن اس کے باوجود بھی جب موقع

پڑتا ہے تو رسول علیؑ کے اوصاف میں رطب اللسان نظر آتے ہیں اور ان

حضرات کے لئے ویسے اوصاف اور اتنی کثرت سے کبھی بیان نہیں کرتے

صرف اس لئے کہ یہ ان کے مقابلہ میں رسول کا بھائی اور داماد ہے۔ تو پھر اس کا نام "مقصباتہ عذرہ پستی" ( ) نہیں تو اور

کیا ہے ؟ اور اگر اس کو بدترین قسم کی "بہر حمانہ جانبداری" اور غیر منصفانہ یا سدا زہی "نہیں کہہ سکتے تو اور کیا کہیں گے ؟ لیکن تاریخ اسلامی کا ہر پڑھنے والا جانتا ہے کہ نبی کریم کی ذات گرامی اس قسم کی تنگ نظر یوں سے بہت بلند و سب سے جانتے اس سوال کا جواب بہت آسان ہے ۔

میں کہتا ہوں کہ نبی کریم قدم قدم پر اشارۃ اور لفظیاً حضرت علی کو اپنا قائم مقام بنانے کی رہبری کرتے رہے۔ لیکن مسلمانوں کو اپنے پیغمبر کے ساتھ کیا اتنا کھینچ سوسکتے تھے کہ آپ کا یہ فعل کسی عذر و تداری کے لحاظ اور بجا یا سدا زہی پر مبنی نہیں ہے بلکہ حقیقتاً اس ذات میں کمالات و خصوصیات ایسے موجود ہیں جو پیغمبر اسلام کو آپ کی تعریف و توصیف پر آمادہ کرتے ہیں اور آپ کو اپنا قائم مقام بنانے کی دعوت دیتے ہیں ۔

اگر ایمان بالنبی جو اسلام کا جزو و عظم ہے مسلمان ضروری سمجھیں تو اس کہنے میں کوئی قباحت نہیں ہے بلکہ ایسا سمجھنا ضروری ہے ۔

یہ سوال کم از کم میرے سامنے عجیب و غریب ہے کہ "اگر فی الواقع نبی کریم حضرت علی کو اپنا خلیفہ بنانے پر مامور ہو چکے تھے تو پھر آپ نے علیؑ کو لا شہادۃ اس کا اعلان کیوں نہیں کیا ۔



اس صورت میں یہ سوال کرنے کے آخر معنی کیا ہیں۔

یہ اسلام کا اتنا اہم و خلی مسالہ۔ اس کے حل کے لئے مستشرقین یورپ کے اس سے متناہک میری سمجھ میں تو نہیں آتا، کیا مستشرقین یورپ تعلیمات اسلام کے روح کو سمجھ گئے ہیں؟ تو پھر کیا حضرت پیغمبر کی ذات پر جو ہیبت و احترام ان کی طرف سے وارد ہوئے رہتے ہیں، انہیں صحیح تسلیم کیا جائے؟ میرے تمام مضمون کو چھوڑ کر جس میں احادیث بالکل شبہ ہی نہیں، بلکہ حیرت و رنجی واقعات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ جناب بزمی صاحب کے یہ نامت کی ایک دلچسپ فرمائی ہے۔ انا مدنیۃ العلم و علی بابا اسکے مقابلہ میں چھپ چکے ہیں حضرت ابو بکر اور حضرت عمر کے فضائل میں ذکر کی ہیں۔ مجھے میرے سنی احباب معاف فرمائیں گے۔ آپ حضرات کی بحث کا یہی انداز کیا ہے کہ آپ کی استدلالی قوت سے بدگمان بنا دیا ہے۔ ہم ہمیشہ یہ دیکھتے ہیں کہ ایک شیعہ اپنے مطلب کی جتنی باتیں پیش کرتا ہے نام لے لے کر صفحہ بند کیا جائے، دیکھ کر آپ کی کتابوں سے۔ آپ اسکے جواب میں یہ کہہ دیتے ہیں کہ جاری ہیں ایک صحیح بخاری ہے اور کچھ نہیں۔ دیکھو وہ مضمون جو ہمارے جواب میں رسالہ "فاران" (جنور میں نکلا ہے) اسکے معنی یہ ہوتے ہیں کہ صحیح بخاری کے علاوہ جتنی تفسیر حدیث علم رجال و سیر کی کتابیں ہیں وہ سب دریا برد

کروانے کے قابل ہیں۔ حالانکہ صحیح بخاری میں بھی شیعوں کے مطلب کی روایتیں مل ہی جاتی ہیں۔

لیکن آپ جب شیعوں کے مقابلہ میں حدیثیں پیش کرنے پر آتے ہیں تو وہی اپنی کتابوں سے یعنی صحیح بخاری اور دوسرے صحاح سے۔ اب بتائیے شیعہ ان حدیثوں کو کیوں تسلیم کریں گے اور ایک غیر جانبدار پر ان روایتوں کا کیا اثر پڑے گا؟

خدا بخش کی لائبریری کے قرآن کو جہاں تک مجھے معلوم ہے شیعہ بھی تسلیم نہیں کرتے۔ پھر اس کے تذکرہ سے نتیجہ کیا؟ ”ثانی اثنبین اذہانی الفاء“ کی آیت کے متعلق ہمارے مضمون میں کافی تبصرہ موجود ہے اب آپ بغیر تبصرہ کچھ نقد و تبصرہ فرمائیے ہوئے یہ کہہ دیا کہ ”یہ آیت غیر شنبہ طور پر حضرت ابوبکر کی منقبت کو ظاہر کرتی ہے“ تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے کس طرح وقت دی جائے؟

”سبقت اسلام“ کے متعلق حضرت علی کی فضیلت کو سبک کرنے کیلئے جو خامہ فرسائی فرمائی گئی ہے وہاں ”کاوش فکری“ کے ساتھ ”ثولیدگی خیال“ کا اثر نمایاں ہے۔

”نوجوانی میں انسانی دماغ غیر نچپہ ہوتا ہے“ مگر انسان میں ذوق تحقیق ہوتا ہے اور قوت خیال و سادس وادہم زیادہ پیدا کرتی ہے اسلئے ان تمام شکوک وادہم کے مقابلہ میں کسی حقیقت پر تسلیم خم کر دینا کچھ کم قابل قدر نہیں ہے۔ ”چہرے بھائی“ اور قریب کے عزیز دوست بھی موجود تھے لیکن انہیں وہ سبقت کا شرف حاصل نہیں ہوا۔ بہر حال سبقت ایک شرف ہے جو ”السابقون السابقون اولئک المقربون“ میں معیار تقرب قرار دیا گیا ہے۔ اُس میں عزیز اور غیر عزیز۔ نو عمر اور پختہ کار کی کوئی تفریق نہیں کی ہے۔ لیکن ہمارے مضمون دیکھ لیا جائے ہم نے اس کو کوئی مستقل دلیل خلافت نہیں قرار دیا ہے۔ آخر ہمارے مضمون کے سلسلہ دلائل کو مرتب صورت سے سامنے رکھ کر اس پر تبصرہ کیوں نہیں کیا گیا!

کہا جاتا ہے کہ ابتدائے اسلام میں ایک مرتبہ نبی کریم نے اپنے اعزاء کے سامنے اسلام کو پیش کرتے ہوئے حضرت علیؑ کے متعلق کہا تھا۔ ان ہذا اخی ووصی و خلیفتی فیکم“ لیکن اس سے خلافت علی پر استدلال کیا جانا کسی صورت سے صحیح نہیں ہو سکتا۔ اس وقت رسول کریم کی پوزیشن ایک بے یار و مددگار ”لیڈر“ سے زیادہ نہ تھی۔ اور اس لئے ان جہلون سے اس موقع کے لحاظ سے جو کچھ مراد لی جا سکتی ہے وہ اس کے

زیادہ نہ ہونا چاہیے کہ حضرت علی کی حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ ان کو  
 اس حالت میں نبی کریم کا واحد معتمد علیہ قرار دیا گیا ہے۔  
 یہ الفاظ جنہیں پورا نقل کر دیا گیا ہے مجھے بہت افسوس ہے کہ ایک  
 مسلمان کے قلم سے دیکھ رہا ہوں۔ کیا نبی کریم مسلمانوں کی نگاہ میں مکار  
 لوگوں کی طرح دنیا دار۔ حیلہ ساز۔ خود غرض۔ اور ابن الوقت تھے؟  
 انہوں نے بے یار و مددگار ہونے کی وجہ سے وقتی طور پر حضرت علی کی  
 حوصلہ افزائی کے لئے کہہ دیا کہ یہ میرے دسی ہیں۔ یہ میرے خلیفہ و جانشین  
 ہیں۔ اس طرح کام نکال لیا اور ان جملوں کے معنی کچھ بھی نہیں تھے؟  
 میں تو سمجھ سکتا ہوں کہ حضرت محمد مصطفیٰ کی سچائی۔ امانت اور دنیا  
 اور بے لوث اخلاق قوی و عملی کو جاننے والا کوئی غیر مسلم بھی آپ کی نسبت  
 اس خیال کی تصدیق نہیں کر سکتا۔



اس جگہ حضرت علی کی امامت و خلافت کے تذکرہ میں بالکل بے جوہر  
 طریقے یہ کہہ دیا گیا ہے کہ جو شخص حضرت علی کو صحیح تسلیم کرے گا تو حضرت  
 حسن کو بھی مانیکا لیکن آپ نے حضرت علی کے قاتل بن محم سے جس طرح  
 انتقام لیا ہے اس کو دیکھ کر ان کی اخلاقی فضیلت کا معیار کیا قائم تھا؟  
 اس کے جواب میں پہلے تو میں یہ کہوں گا کہ ایک غیر جانبدار شخص کے



سامنے حضرت علی کی خلافت کی بحث میں امام حسن کی امامت کا سوال پیدا ہوا  
 نہیں ہوتا۔ بہت ممکن ہے وہ تحقیق کی بناء پر حضرت علی کی امامت کو تسلیم  
 کرے اور حضرت حسن کو تسلیم نہ کرے۔ اس کے علاوہ جو واقعہ حضرت حسن  
 کی نسبت پیش کیا جا رہا ہے اُس کو شیعہ فریق فرقہ خوارج کی اختراع  
 قرار دیتا ہے۔ لہذا قابل تسلیم نہیں ہے۔ پھر اسکے مقابلہ میں وہ متفقہ  
 تاریخ کا واقعہ پیش کرتے ہیں کہ حضرت ابو بکر نے فجاہ سلمیٰ کو زندہ آگ  
 میں ڈال کر مہلادیا۔ اس کے متعلق سوال پیدا ہوگا کہ اخلاقی معیار فضیلت  
 کی بناء پر یہ فعل صحیح سمجھا جائے گا یا نہیں۔



مجھے بھی اب زیادہ تفصیلی بحث نہیں کرنا ہے میرا گذشتہ مضمون حقیقت  
 ابھی تک بالکل کورا ہے اور اُس تک دست نقد اعتراض نہیں ہو چکا ہے  
 شیعیت کے ایرانی سائبر تربیت میں ایجاد ہونے کے فرضی افسانے  
 بنانے سے حقیقت بدل نہیں جائے گی۔ اصل مسئلہ پر گفتگو ان چیزوں کے  
 بالکل علیحدہ ہے۔



سب سے آخر میں مجھے اس فقرہ پر دیا کرنا ہے کہ "خلافت و امامت کا  
 مسئلہ نہ تو کوئی ایسا مسئلہ ہے جو آج درخور اعتنا کہا جاسکے اور نہ "شیعیت"

اسلام کا کوئی مذہبی فرقہ "خلافت کو ہیت ہے یا نہیں" اسکو تو مسلمان ہی سمجھ سکتے ہیں۔ میرے خیال میں تو اس بحث کی اہمیت مسلمانوں کی عملی اخلاقی تعلیمی زندگی کے اعتبار سے سمجھی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے احکام و تعلیمات مذہبی میں کن پیشوایان دین کو اپنا رہنما قرار دین اور ان کے تعلیمات پر عمل کریں۔ اسی طرح یہ فقرہ کہ "شیعیت اسلام کا کوئی مذہبی فرقہ" اس کا جواب یہ ہے کہ دے سکتے ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں میں افتراق ہی قسم کی تعبیری بے اعتدالیوں کی وجہ سے ہے۔ آپ کہنے لگے گا "شیعیت اسلام کا کوئی مذہبی فرقہ نہیں" "شیعوں کہیں گے" "سنیت اسلام کا کوئی مذہبی فرقہ نہیں" نتیجہ اس کا انتشار ہے اور کچھ نہیں۔ یہ بھی ہو جائے کہ سنی سب شیعہ بن جائیں یا شیعہ سب سنی بن جائیں غیر ممکن۔ لیکن اتحاد و اتفاق کی صورت یہ ہے کہ آپ ان کی مذہبی حیثیت کو تسلیم کیجئے اور ان کا احترام کیجئے۔ وہ آپ کی مذہبی حیثیت کو تسلیم کریں اور احترام کریں چلئے اس طرح پیشواؤں کے مجتمع رہیں اور ملت اسلامیہ کا نظام درہم و برہم نہ ہوگا۔ خدا جانتا ہے کہ مسلمانوں کا خیر خواہ ہوں اس لئے اتنا لکھ بھی دیا نہیں تو مجھ سے کیا مطلب۔ فقط

"ہر نام"

— (۳) —

# فت مت مسئلہ خلا و اما

(میں نے نقطہ نظر سے)

(از قلم جناب نیاز فتحپوری مدیر نگار)

نگار میں اس مسئلہ کی ابتدا ایک صاحب، ہر نام کے مضمون سے ہوئی جنہوں نے شیعہ نقطہ نگاہ اور استنادات اہل تشن سے، وصایت ولایت جناب امیر کو ثابت کیا تھا، اس کے جواب میں جو مضامین اہل تشن کی طرف سے موصول ہوئے ان میں اکثر تشنہ و نامکمل تھے۔ صرف جناب بوسعید بزمی ایم۔ اے کا ایک مقالہ ایسا تھا جو اشاعت کے قابل سمجھا گیا، در اٹھا لیا۔ وہ بھی کوئی قاطع جواب ہر نام کے مضمون کا نہ تھا۔ اس کے بعد ہر نام صاحب کا پھر دوسرا مقالہ نومبر کے نگار میں جناب بزمی کے جواب میں شائع ہوا۔ اور اسی کے ساتھ میں نے وعدہ کیا کہ اب بغیر کسی مزید انتظار کے اپنی اس مسئلہ میں پیش کردہ گام۔ دسمبر میں مجھے اس مسئلہ پر کچھ لکھنے کا موقع نہ ملا، جنوری میں اس بحث کی گنجائش نہ تھی اس لئے اب فروری کی ابتدا

میں اپنے اس وعدہ کا ایفا کرتا ہوں۔  
 ہر نام کا استدلال دو باتوں پر مشتمل تھا ایک یہ جناب میرا اپنے خصائل و عادات  
 کے لحاظ سے بھی مرجح حق خلافت کا رکھتے تھے اور دوسرے یہ کہ خود رسول شریف  
 نے بھی غدیر خم میں پورا اسکے قبل و بعد متعدد بار اپنے بعد ولایت و وصایت  
 علی کی صراحت فرمائی تھی۔ اس سلسلہ میں فاضل مقالہ نگار نے تمام روایات  
 و اسناد وہی پیش کئے تھے جو اہل تشنن کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں اور اس لئے  
 سنیوں کی طرف سے جواب کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں یا تو یہ کہ وہ سرے  
 سے ان روایات کے وجود ہی سے انکار کریں یا یہ کہ وہ ان روایتوں کا  
 کوئی مفہوم اور تباہی میں۔ ظاہر ہے کہ اول صورت جواب کی اختیار نہیں کی  
 جاسکتی کیونکہ وہ روایات تو کتابوں سے نکالی نہیں جاسکتیں، اس لئے  
 عموماً دوسری صورت اختیار کی جاتی ہے یعنی بعض تو ان روایتوں کو ضعیف  
 قرار دے کر ناقابل اعتبار خیال کرتے ہیں اور بعض الزامی جواب کے انداز میں  
 ان احادیث کو پیش کرتے ہیں جو فضائل جناب شیخین میں ان کے بیان پائی  
 جاتی ہیں۔ در انحالیکہ ان دونوں میں سے کوئی طریقہ جواب کا مفید یقین  
 نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جن روایتوں کو آج ضعیف کہہ کر ناقابل استناد قرار دیا  
 جاتا ہے وہ قدما کے نزدیک حد درجہ قابل وثوق سمجھی جاتی تھیں اور فضائل  
 شیخین کو جناب میر کے حق ولایت و خلافت سے کوئی دھڑلہ نہیں کیونکہ ایک



فضیلت نہ دوسرے کی فضیلت سے انکار کا مترادف ہو اُکرتی ہے اور نہ اس سے کسی دوسرے کا حق مٹا ہو سکتا ہے۔

غالباً مناسب ہوگا کہ پہلے ایک اجمالی تبصرہ اس وقت تک کے مضامین پر کر دیا جائے تاکہ جس حد تک روایتی استنادات کا تعلق ہے یہ بحث ابتدا ہی میں ختم ہو جائے۔

سب سے پہلی خصوصیت جناب امیر کی ہر نام صاحب نے یہ بیان کی ہے کہ اپنے سب سے پہلے اسلام قبول کیا۔ ہر چند سابقیت اسلام کوئی ایسا مسئلہ نہیں جو خلافت و امامت پر موثر ہو سکے، لیکن چونکہ رسالہ فامان میں کسی صاحب (مولوی فاروق) نے ہر نام کے مضمون کا جواب لکھتے ہوئے اس کی بھی تردید کی تھی اس لئے نامناسب نہوگا اگر اس مسئلہ پر بھی محاکمہ کیا جائے۔

مولوی فاروق صاحب نے بروایت بخاری ثابت کیا ہے کہ حضرت علی کا نمبر اسلام لانے والوں میں چوتھا یا تھوڑا تھا لیکن بخاری کی جن دو روایتوں سے ہتھکڑیا جاتا ہے ان دونوں کے ایک راوی اسماعیل بن مجاہد ہیں جو نسائی کے نزدیک ضعیف اور حاکم کی رائے میں ناقابل اعتبار ہیں۔ دارقطنی نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اسماعیل کے ضعف پر اجماع ہے۔ الغرض بخاری کی ایک ایسی روایت پر جو درجہ احاد سے آگے نہیں بڑھتی اور مجروح بھی ہے، تمام جمہور محدثین کے اس فیصلہ کو کیونکر رد کیا جاسکتا ہے

کہ حضرت خدیجہ کے بعد سب پہلے جناب امیر سی نے اسلام قبول کیا۔ بلکہ بعض روایتوں سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ سب پہلے حضرت علی ہی ایمان لائے چنانچہ دارقطنی نے ابوسعید خدری سے۔ امام احمد نے حضرت عسکرمہ حاکم نے معاذ سے عقیلی نے حضرت عائشہ سے جو روایت کی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خود رسول اللہ نے اپنی زبان سے فرمایا کہ ”مجھ پر ایمان لانے والوں میں سب پہلے علی بن“۔

الغرض ان تمام روایات کے ہوتے ہوئے امام بخاری کی ایک مخرج روایت کو استدلال میں پیش کرنا کسی طرح مناسب نہیں۔

دوسرا استدلال جناب امیر کی وصایت و امامت کے ثبوت میں ہر نام صاحب نے یہ پیش کیا ہے کہ جب جناب رسول اللہ کو ”انذر عشیرتک الا قربین“ کی ہدایت ہوئی تو آپ نے اپنے اعزہ و اولاد عبد المطلب و ہاشم کو جمع کر کے ایک تقریر کی اور اس میں جناب امیر کو ”اخئی و وصی و خلیفتی فیکم“ (اپنا بھائی اور اپنا ولی عہد و جانشین) ظاہر کیا۔ اس کا جواب بھی سنیوں کی طرف سے یہ دیا جاتا ہے کہ بخاری میں یہ روایت نہیں پائی جاتی۔ در انحالیکہ سند احمد بن حنبل، خصائص نسائی، سیوطی، اسحاق، تفسیر ابن ابی حاتم، دلائل بہیض و ابوغنیم میں واقع تفصیل کے ساتھ اور مستند طریقہ سے مروی ہے۔ محض بخاری میں نہ پایا جاتا کوئی

مقول وجہ انکار کی نہیں ہو سکتی۔ رہا جناب ابوسعید خدری کا یہ کہنا کہ رسول اللہ  
کا ایسا فرمان صرف حضرت علی کی حوصلہ افزائی کے لئے تھا ایک ایسا دعویٰ  
ہے جس پر نہ کوئی ثبوت پیش کیا جاسکتا ہے اور نہ جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم  
کرنا اچھا معاملہ ہوتا ہے۔

تیسری خصوصیت جناب امیر کی ہر نام صاحب نے یہ بیان کی ہے کہ  
جب رسول اللہ نے پوشیدہ طور پر مکہ سے ہجرت کا ارادہ کیا تو اپنے بستر پر جناب  
امیر کو لٹا کر تشریف لے گئے۔ اس میں شک نہیں کہ حضرت علی کا رسول اللہ  
کے بستر پر لٹ جانا انتہائی خطرہ کی بات تھی اور آپ کا اس خطرہ کو گوارا  
کر لینا جان نثاری کا ایسا زبردست ثبوت ہے کہ اس سے زیادہ قوی ثبوت  
کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

اس واقعہ سے بھی بعض علماء اہل تسنن صرف اس لئے انکار کرتے ہیں  
کہ بخاری میں کوئی ایسی روایت نہیں پائی جاتی۔ لیکن یہ کوئی قابل اعتبار  
استدلال نہیں ہے کیونکہ علاوہ بخاری کے تمام کتب احادیث و تفسیر تاریخ  
میں اس کا ذکر موجود ہے۔ مسند احمد بن حنبل، سنن امام نسائی، سنن ابن ماجہ  
نسخہ نص نسائی، سیرۃ ابن ہشام، سیرۃ ابن اسحاق، تفسیر تعلی، تفسیر  
ابو عاتمہ رازی، تاریخ کبیر اور اسد الغابہ وغیرہ تمام کتابوں میں ہر شخص  
اس کا مطالعہ کر سکتا ہے۔

چوتھی خصوصیت موصافہ کی ہر نام صاحب نے ظاہر کی ہے یعنی جب کہ رسول اللہ  
نے رشتہ شریف لانے کے بعد ہمارے دربار میں بھائی چارے کی رسم  
قائم کی تو جناب امیر کی موصافہ خود اپنی ذات سے کی اور ارشاد فرمایا :-  
"انت انی فی الدنیا والاخرۃ" "اے علی تو دنیا و آخرت میں میرا  
بھائی ہے"۔ اس واقعے سے بھی اہل تسنن صرف اس لئے انکار کرتے ہیں کہ  
جناب امام بخاری اس سلسلہ میں خاموش ہیں، درحالیکہ دیگر کتب احادیث  
میں بارہ صحابہ کی روایت سے اس واقعہ کی تصدیق ہوتی ہے۔

پانچویں خصوصیت ہر نام صاحب نے یہ ظاہر کی ہے کہ مسجد نبوی کے  
چاروں طرف جتنے صحابہ کے گھر تھے ان سب کے دروازے رسول اللہ  
بندر کے لیکن حضرت علی کے گھر کا دروازہ صحن مسجد کی طرف کا بند نہیں کرایا۔  
یہ واقعہ بھی اہل تسنن کی کتب احادیث و تاریخ میں صراحتاً موجود ہے امام  
احمد بن حنبل، امام نسائی، حاکم، طبرانی، ترمذی، بیہقی اور ابی عساکر  
وغیرہ سب بالاتفاق اس واقعہ کی صحت کے شاہد ہیں۔

چوتھی خصوصیت جناب امیر کی ہر نام صاحب نے یہ بتائی ہے کہ آپ رسول اللہ  
کے داماد یعنی اس محبوب بیٹی کے شوہر تھے جس کو جناب رسالت سیدۃ النساء العالمین  
سیدۃ النساء المؤمنین سیدۃ النساء اہل الجنۃ کے الفاظ سے یاد فرمایا کرتے  
تھے۔ اور یہ واقعہ ایسا ہے جس کے کسی کو انکار ہو ہی نہیں سکتا۔



ساتویں خصوصیت ہر نام صاحب نے حضرت علی کی یہ ظاہر کی ہے کہ جنگ بدر، جنگ احد اور جنگ خیبر وغیرہ میں جو کارہائے نمایاں آپ نے کئے وہ دوسروں سے ظاہر نہ ہو سکے بلکہ بعض موقعوں پر تو تمام اکابر صحابہ رسول اللہ کا ساتھ چھوڑ کر چلے گئے اور صرف حضرت علی رہ گئے چنانچہ آپ کی انہیں خصوصیات جرات و وفاداری کی بنا پر رسول اللہ نے خیبر کی ہم پر روانہ کرتے وقت آپ کو "کراغیر فرار" کے الفاظ سے یاد فرمایا۔

ان تہم جنگوں میں جناب امیر نے جس غیر معمولی شجاعت و ثابت قدمی سے کام لیا اس کے اعتراف پر اہل تسنن بھی مجبور ہیں لیکن خیبر کی ہم روانہ کرتے وقت رسول اللہ کا جناب امیر کو "کراغیر فرار" کہنا اور جنگ احد و جنگ حنین میں تمام اکابر صحابہ یہاں تک جناب ابو بکر اور جناب عمر کا بھی رسول اللہ کا تنہا چھوڑ کر چلا جانا ایسی باتیں ہیں جو سنو کے لئے ناقابل قبول ہیں۔ لیکن رسول اللہ کا جناب امیر کو "غیر فرار" کے لفظ سے خطاب کرنا ہی معنی رکھتا ہے کہ اس سے قبل جو صحابہ دینی جناب ابو بکر و جناب عمر پر حمیم اسلام لیکر خیبر فتح کرنے گئے تھے اور ناکام واپس آئے وہ بھاگ آنے والوں میں تھے اور جنگ حنین و جنگ احد میں تو خیر کھلم کھلا ان حضرات پر رسول اللہ کا ساتھ چھوڑ دینے کا الزام قائم کیا جاتا ہے۔

اہل تسنن برنبائے امام بخاری الفاظ "کراغیر فرار" کی صحت سے

انکار کرتے ہیں، حالانکہ ابن اسحاق، نسائی، احمد، ابن ابی شیبہ، ابن جریر،  
طبرانی، بیہقی نے اور دارقطنی، خطیب اور ابن عساکر نے تو خود حضرت عمر سے  
انھیں الفاظ کے ساتھ روایت کی ہے۔ علاوہ اس کے جناب ہر نام کا یہ  
استدلال کہ اگر "کرا وغیرہ" کے الفاظ نکال دیے جائیں تو حضرت ابو بکر اور  
حضرت عمر کی اور زیادہ تو ہیں متصور ہے، کیونکہ اس صورت میں حدیث  
کے معنی یہ ہوں گے کہ حضرت علی سے قبل جو حضرات پرچم اسلام لے گئے  
تھے وہ خدا و رسول کے دوست بھی نہ تھے ملاحظہ ہو نگار ماہ مارچ ۱۹۳۵ء  
رگہا جنگ حد و جنگ خین میں تمام اکابر صحابہ کا فرار ہو جانا، سو اگر  
باوجود متعدد احادیث اہل تسنن کی موجودگی کے اس سے انکار بھی کر دیا  
جائے تو حضرت علی کی عدیم النظیر خدمات کو ایک مخصوص امتیاز دینا  
لازم ہے، کیونکہ ان کے پیچھے موڑ کر چلے جانے یا رسول اللہ کا ساتھ چھوڑ  
دینے کی ایک روایت بھی کسی جگہ نہیں پائی جاتی۔

ساتویں خصوصیت ہر نام صاحبے حدیث منزلت سے ثابت کی ہے  
یعنی جب غزوہ تبوک میں رسول اللہ نے اپنے ساتھ تمام صحابہ کو چلنے کا  
حکم دیا تو حضرت علی کے متعلق ارشاد ہوا کہ وہ مدینہ ہی میں قیام کریں جس سے  
آپ کبیدہ خاطر ہوئے۔ رسول اللہ نے آپ سے فرمایا: "کیا تم اس پر غمی نہیں  
ہو کہ تم مجھ سے وہی نسبت رکھو جو ہارون کو موسیٰ سے حاصل تھی سو اے اسکے

کہ میرے بعد کوئی نبی ہونے والا نہیں ہے۔“

چونکہ یہ حدیث بخاری میں بھی موجود ہے اس لئے اہل تسنن اس واقعہ سے انکار تو نہیں کر سکتے لیکن وہ اس کو کوئی ایسا زیادہ اہم بھی نہیں سمجھتے۔ ہو سکتا ہے کہ اس حدیث سے استخلاط جناب امیر ثابت نہ ہو سکے لیکن انکی فضیلت تمام دیگر صحابہ پر ضرور ظاہر ہوتی ہے، چنانچہ امام نووی نے شرح مسلم میں بھی اس کو تسلیم کیا ہے۔

آٹھویں خصوصیت ہر نام صاحب نے یہ بتائی ہے کہ جب سورہ براہت نازل ہوئی تو رسول اللہ نے حضرت ابو بکر کو مامور کیا کہ جا کر اہل مکہ کو اس کی تبلیغ کریں، جب وہ چلے گئے تو وحی نازل ہوئی کہ اس کی تبلیغ خود رسول اللہ کرنا چاہیے یا اپنے کسی عزیز تر بیکے ذریعے۔ چنانچہ آئے جناب امیر کو روانہ فرمایا کہ وہ حضرت ابو بکر سے سورہ براہت لیکر اہل مکہ کو جا کر نمایاں اور جناب امیر کو یہ خدمت تفویض کرتے وقت فرمایا کہ :-

”علی منی وانا منہ ولا یودی عنی الا انا وعلی“ (علی مجھ سے

ہے اور میں علی سے ہوں اور اپنی تر جانی یا میں خود کر سکتا ہوں یا علی)

یہ واقعہ بھی اہل تسنن کی تمام کتب معتبرہ اعاذیث و تفاسیر میں موجود ہے اور اس سے انکار ممکن نہیں بعض اہل تسنن اس کو بھی کوئی اہمیت نہیں دیتے، دراصل لیکر اس سے یہ حقیقت روشن ہو گئی کہ جو خدمت خود

ذات نبوی سے متعلق ہو سکتی تھی اس کو صرف حضرت علی ہی انجام دے سکتے تھے۔

زین خصوصیت کا اظہار جناب ہر نام نے اس واقعہ کے سلسلہ میں کیا ہے جب جناب امیر تبلیغ اہل بین کے لئے امور کئے گئے تھے اور آپ کے خلاف چند لوگوں کی شکایت سن کر فرمایا تھا کہ ”مجھ سے علی کی برائی نہ کرو“ فانہ منی وانا منہ وھو ولیکم بعدی ”علی مجھ سے ہے، میں علی سے ہوں اور وہ میرے بعد تمھارا حاکم ہے“ بعض احادیث میں الفاظ وھو ولیکم بعدی کے نہیں پائے جاتے اور بعض میں ”وھو مولیٰ کل مومن ومومنة“ پائے جاتے ہیں۔ شکایت یہ تھی کہ جناب امیر نے خمس میں سے ایک نوٹدی اپنے لئے منتخب کر لی۔ امام بخاری کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شکایت شکر رسول اللہ نے یہ بھی فرمایا کہ ”فان لہ فی الخمس اکثر من ذلک“ (علی کا حصہ خمس میں اس سے بھی زیادہ ہے) یہ حدیث بھی اہل تسنن کی تمام معتبر کتابوں میں پائی جاتی ہے اور اس سے جو منزلت جناب امیر کی ظاہر ہوتی ہے وہ بھی کسی سے مخفی نہیں۔

دسویں خصوصیت وہ ہے جو خطبہ حجة الوداع اور غدیر خم سے متعلق ہے اور اس میں کلام نہیں کہ حضرات شیعہ کے پاس ولایت جناب امیر کی یہ سب سے بڑی شہادت ہے۔ یہ واقعہ مختصر انویں ہے کہ جب حج سے فارغ



ہونے کے بعد قافلہ نبوی غدیر خم پر پہنچا تو رسول اللہ نے سب کو روک کر ایک تقریر فرمائی اور اس میں اپنے وصال کی خبر دیتے ہوئے کہا کہ "من كنت مولاه فعلى مولاه" میں جس کا مولیٰ ہوں علی بھی اس کا مولیٰ ہے۔ اور یہ بھی ارشاد فرمایا کہ :-

"میں اپنے بعد دو چیزیں چھوڑے جاتا ہوں ایک کتاب اللہ اور دوسری میری عزت، میرے اہلبیت اور انھیں دونوں کی پیروی کرنا چاہیے۔" بعض علماء اہل تسنن اس واقعہ سے بھی صرف اس لئے انکار کرتے ہیں کہ امام بخاری نے اس کی روایت نہیں کی اور ابن تیمیہ نے اس کو بے اصل بتایا ہے۔ حالانکہ صرف بخاری کا روایت نہ کرنا یا ابن تیمیہ کا انکار اتنا محدود و متواتر تصدیقوں کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتا جو اس باب میں پائی جاتی ہیں۔

امام المحدثین حافظ ابن عقیلہ نے ایک سو ایک صحابہ سے اس حدیث کی روایت کی ہے، امام جزیری و شافعی نے انہی صحابیوں سے امام احمد بن حنبل نے تیس صحابیوں سے اور طبری نے پچھتر صحابیوں سے علاوہ اس کے تمام اکابر اسلام مثلاً ذہبی، صنعانی اور علی القاری وغیرہ اس حدیث کو مشاہیر و متواتر مانتے ہیں۔

اخیر میں ہر نام صاحب نے واقعہ فرط اس کو بھی پیش کیا ہے لیکن اس کا

تعلق اول تو وصایت جناب امیر سے ہے بھی نہیں کہ کیونکہ اب یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ رسول اللہ کا غزو قلم منگو کر کیا لکھوانا چاہتے تھے (اور دوسرے یہ کہ یہ حدیث اہل تسنن کے نزدیک قابل لحاظ بھی نہیں ہے، کیونکہ اس کے خاص راویوں میں سے ایک یحییٰ بن سلیمان بن جو غیر ثقہ قرار دئے گئے ہیں دوسرے راوی ابی عبد اللہ بن جو بہت غلط گو سمجھے جاتے ہیں۔ تیسرے یونس بن یزید بن جن کا حافظہ بھی ضعیف تھا اور جو غلط گو بھی تھے، چوتھے راوی علی بن عبد اللہ بن جن کا شمار ضعیف امین ہے رہ گئے ایک راوی حضرت ابن عباس سوان کا اس وقت وہاں موجود ہونا ثابت نہیں۔

دوسوین خصوصیت جناب ہر نام نے یہ ظاہر کی ہے کہ رسول اللہ نے وقت آخر میں فرمایا کہ "بلاؤ میرے حبیب کو، چنانچہ پہلے حضرت ابو بکر آئے لیکن آپ نے توجہ نہیں کی، اس کے بعد حضرت عمر شریف لائے لیکن دیکھ کر پھر تکبیر پر سر رکھ لیا، تیسری مرتبہ جب حضرت علی آئے تو آپ نے انہیں حیا دین لے لیا اور برابر لئے رہے۔ یہاں تک کہ آپ کا انتقال ہو گیا۔ ہر چند مسئلہ خلافت دو لا بہت سے براہ راست اس واقعہ کا تعلق نہیں ہے۔ لیکن فضیلت جناب امیر ثابت کرنے کے لئے یقیناً یہ نہایت زبردست دلیل ہے۔

بعض علماء اہل تسنن اس حدیث کی صحت سے بھی منکر ہیں اور میرزا

ان کا یہ انکار بھی درست نہیں، کیونکہ اس حدیث کو امام نسائی، امام احمد بن  
 حنبل، دارقطنی، امام رازی اور حاکم سب نے روایت کیا ہے،  
 یہاں تک تو میں نے ہر نام صاحب کے تمام روایتی استدالات کا خلا  
 پیش کر کے ان کے متعلق اپنی رائے ظاہر کر دی اور اس میں شک نہیں کہ  
 ان روایات و واقعات سے نہ صرف یہ کہ جناب امیر کی غیر معمولی فضیلت ثابت  
 ہوتی ہے بلکہ بڑی حد تک یہ بھی کہ رسول اللہ اپنے بعد آپ ہی کو جانشین بنانا  
 چاہتے تھے۔ اہل تسنن جو اگلے دو طریقے اختیار کرتے ہیں ایک یہ کہ وہ ان  
 میں سے بعض روایات کو صرف اس لئے غلط قرار دیتے ہیں کہ امام بخاری  
 نے ان کو درج نہیں کیا حالانکہ یہ ایسا ہکیسا نہ طریقہ رد اعتراض کا ہے کہ  
 اسکی کمزوری میں کیا ہر شخص محسوس کر سکتا ہے۔ دوسرا طریقہ اس سے بھی زیادہ  
 عجیب و غریب ہے، یعنی یہ کہ حضرت علی کے فضائل کے جواب میں حضرت ابو بکر  
 اور حضرت عمر کے فضائل کی احادیث پیش کرنے لگتے ہیں۔ اول تو جواب کی یہ  
 صورت اس لئے بھی بیکار ہے کہ جن احادیث کو پیش کرتے ہیں وہ حضرات  
 شیعہ کی کتابوں میں نہیں پائی جاتیں اور خلافت اہل شیعہ کے کہ فضائل  
 حضرت علی کی روایات اہل تسنن کی کتابوں سے پیش کرتے ہیں۔ (دوسرے  
 یہ کہ اگر فضائل شیعہ کی احادیث کو صحیح مان لیا جائے تو اس سے اصل  
 مسئلہ خلافت و امامت جناب امیر پر کیا اثر پڑ سکتا ہے جبکہ حضرت علی کے

مرتبہ و فضیلت سے اہل تسنن کو بھی انکار نہیں۔

الغرض جس حد تک روایات کا تعلق ہے میرے نزدیک حضرات شیعہ  
اس اعتقاد میں بالکل حق بہ جانب ہیں کہ رسول اللہ کی دلی خواہش یہی تھی کہ  
حضرت علی آپ کے بعد جانشین قرار دئے جائیں لیکن گفتگو اس میں ہو سکتی  
ہے کہ رسول اللہ کی اس خواہش کا حالات کے اقتضائے لحاظ سے پورا ہونا  
ممکن و مناسب تھا یا نہیں۔ اور دوسرے یہ کہ اگر حضرت علی رسول اللہ  
کے بعد خلیفہ قرار نہیں دئے گئے تو یہ کوئی مسئلہ ایسا اہم تھا جو تفریقِ مذاہب  
کا باعث ہو سکے؟

جہاں تک میں نے غور کیا ہے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ خلافت کا مسئلہ  
کوئی مذہبی مسئلہ نہیں ہے اور اگر کوئی جماعت اس کی قائل ہے تو اس کے  
معنی یہ ہیں کہ اس نے نہ اسلام کی تعلیمات پر غور کیا ہے، نہ اس کے صحیح مقصد  
کو اس نے سمجھا ہے اور نہ منصبِ نبوت کے حقیقی مفہوم سے اسے آگاہی حاصل ہے۔

اس سے غالباً شیعہ دینی کسی کو انکار نہیں کہ تعلیمات اسلام مذہبِ سیاست

دونوں پر حاوی ہیں یعنی اگر رسول اللہ کو ایک طرف مبلغِ احکامِ خداوندی  
کی حیثیت حاصل تھی تو دوسری طرف آپ ایک سیاست دان فرمانروا کا  
بھی رکھتے تھے۔ لیکن ان دو مختلف حیثیتوں کا آپ کے منصبِ نبوت سے



کیا تعلق تھا؟ اس کو سب نے نظر انداز کر دیا ہے اور یہی اصل سبب تمام نزاعات کا ہے۔ اس لئے آئیے سب سے پہلے اسی مسئلہ پر غور کریں۔

نبی یا رسول کا لغوی مفہوم جو کچھ بھی رہا ہو لیکن اس کا اصطلاحی مفہوم ہمیشہ یہی قرار دیا گیا کہ نبی وہ غیر معمولی انسان ہے جو خدا کی طرف سے کوئی پیغام لایا ہو، جو معجزوں کا حامل ہو، پیشین گوئیوں کرتا ہو، غیب کی باتیں جانتا ہو بات بات میں خدا فرشتے بھیج کر اس کی مدد کرتا ہو، محالات کو ممکن بنا دینے پر قادر ہو، بالکل معصوم ہو، لغزش و غلطی سے مبرا ہو، جس کا ہر قول و فعل ہر وقت الہام خداوندی کے ماتحت ظہور پذیر ہوتا ہو یعنی مختصر یہ کہ اس میں عام خصوصیات انسانی بالکل نہ پائی جائیں اور وہ ایک "غیر انسانی" انسان ہو۔

آپ تمام مذاہب عالم کی تاریخ کا مطالعہ کر جائیں، بہ ادنیٰ تغیر الفاظ نبی یا رسول کا مفہوم آپ کی ہی نظر آئے گا۔ لیکن یہ خصوصیت صرف اسلام کو حاصل ہے کہ سب سے پہلے اسی نے نبی کے اس عجیب و غریب مفہوم کی تردید کی اور تمام مذاہب میں وہی ایک مذہب ایسا ہے جس نے نبوت کے اس طلسم زار کو توڑ کر اس کے حقیقی خط و خال دنیا کے سامنے پیش کئے۔ انسان کو دیگر مخلوقات کے لحاظ سے ہر شرف المخلوقات صرف اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس کو عقل و فراست عطا ہوئی ہے اور وہ اپنے جذبات حیوانی

سے مغلوب نہیں ہو سکتا اگر وہ چاہے۔ بالکل اسی طرح ایک نبی، دو سکر  
انسانوں کے مقابلہ میں صرف یہ شرف رکھتا ہے کہ اس میں وہ تمام قوتیں  
جو ایک انسان کو حیوان سے متمیز کرتی ہیں، زیادہ تکمیل کے ساتھ پائی  
جاتی ہیں اور وہ باوجود تمام جذبات حیوانی رکھنے کے ان کے ضبط پر  
غیر معمولی قدرت رکھتا ہے۔

ہم ایک شخص کو دیکھتے ہیں جو حد درجہ مسکین و غریب ہے، جو کبھی کسی سے  
انتقام نہیں لیتا، جو ہر شخص کے سامنے گردن جھکا دیتا ہے اور ہم اس کی  
صلاحیت نفس کی تعریف کرتے ہیں۔ کیونکہ اس لئے کہ وہ غیر معمولی  
ضبط سے کام لیکر اپنے جذبات حیوانی پر قابو رکھتا ہے۔ لیکن اگر ہم کو یہ  
معلوم ہو جائے کہ قدرتا وہ حد درجہ بے حس واقع ہوا ہے تو ہم بجائے  
تعریف کرنے کے اس کو بزدل و بے غیرت کہیں گے۔

ایک شخص حد درجہ عفت مآب و پاکباز ہے اور ہم اس کے ضبط نفس  
کی تعریف کرتے ہیں، لیکن اگر ہم یہ جان جائیں کہ اس میں قدرت کی طرف  
سے یہ مادہ ہی نہیں پایا جاتا اور وہ فطرتاً ناکارہ پیدا ہوا ہے تو پھر  
ہم بجائے تعریف کے اس کی حقارت کرنے لگتے ہیں۔

الغرض ایک انسان کا کمال یہی ہے کہ وہ باوجود گناہ پر قدرت  
رکھنے کے اس سے باز آئے، وہ جھوٹ بول سکتا ہو لیکن نہ بولے، وہ غصہ

ہو سکتا ہو لیکن نہ کرے۔ ماحول سے متاثر ہو سکتا ہو لیکن نہ ہو، اسی پر ایک نبی  
 نے خصوصیات کا زیادہ وسیع پیمانہ پر قیاس کر لیجئے اگر ہم یہ مان لیں کہ نبی  
 فطرًا معصوم پیدا ہوا ہے تو اس کی عصمت کوئی قابل تعریف بات نہیں  
 اگر وہ غیب کی باتیں جان لیتا ہے تو اس کی فراست و پیش بینی بے معنی  
 ہے اگر فرشتے اس کی مدد کرتے ہیں تو اس کی کامیابیاں کوئی حقیقت نہیں  
 رکھتیں، اگر اس سے کوئی غلطی ہو ہی نہیں سکتی، تو اس کی سلامت روی  
 ہیج ہے۔ ایک نبی کو دوسرے انسانوں کے مقابلے میں امتیاز اگر حاصل  
 ہے تو صرف یہ کہ وہ باوجود ان تمام جذبات رکھنے کے جو تمام لوگوں میں  
 پائے جاتے ہیں ان کے ضبط پر دو سکے انسانوں سے زیادہ قادر ہے،  
 وہ دو سکے انسانوں کی طرح سوچتا ہے لیکن بہت غایز نگاہ سے، وہ مخالف  
 و مقابل قوتوں سے متاثر ہوتا ہے لیکن بہت کم، وہ کسی غایت تک  
 پہنچنے کے لئے انہیں اسباب و دلائل کو سامنے رکھتا ہے جو دوسروں  
 کے سامنے ہیں اور اکثر صحیح نتیجہ پر پہنچتا ہے۔ الغرض وہ ہماری طرح  
 ایک انسان ہے لیکن بلند ترین سطح کا اور انسانی فراست سے غلطی یا غرض  
 اس دنیا میں ہو سکتی ہے وہ اس سے بھی ممکن ہے لیکن بہت کم۔ وہ اپنی  
 نیت کے لحاظ سے اپنے مقاصد کے نقطہ نظر سے یقیناً ایک معصوم انسان  
 ہے لیکن اپنی تدابیر "نبی فہم و دانش" کے لحاظ سے اس کا روبرو عالم میں کبھی

کبھی اجتہادی غلطی بھی کر سکتا ہے اور یہی وہ مفہوم نبوت کا تھا جسے سب سے پہلے اسلام نے پیش کیا اور جس کو سامنے رکھ کر ہم رسول اللہ کی غیر معمولی عظمت تسلیم کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

ممکن ہے مسلمانوں کی جماعت نبوت کے اس مفہوم کو شکر متعجب ہو، علی الخصوص حضرات شیعہ، جو نہ صرف رسول اللہ بلکہ اہلبیت کے تمام افراد کو معصوم جانتے ہیں لیکن کیا کروں کلام پاک سے نبوت کا مفہوم میری سمجھ میں ہی آتا ہے اور اس سے ہٹ کر "پیدائشی معصومیت" سے نبی کو متصف کرنا میرے نزدیک منصب نبوت کی توہین کرنا ہے۔

نبی آخر الزمان سے قبل نبوت کا جو مفہوم لوگوں کے ذہن نشین تھا وہ یہ تھا کہ "رسول" نوع انسانی سے علیحدہ کوئی چیز ہے اور اس کا تعلق فرشتوں سے ہے۔ اس کی تردید رسول اللہ کی زبان سے یوں کی گئی۔

قل لو کان فی الارض ملائکة میمشون مطہنین لنزلنا علیہم من السماء ملکاً رسولاً (سورہ بنی اسرائیل آیت ۹۵) یعنی اگر زمین میں بجائے انسانوں کے فرشتوں کی آبادی ہوتی تو ہم کسی فرشتہ ہی کو رسول

لہ وما منع الناس ان یؤمنوا اذ جاءہم الہدی الا ان قالوا ابث اللہ بشر رسولاً (ایمان لانے سے جس چیز نے لوگوں کو باز رکھا وہ یہ تھی کہ وہ کہا کرتے تھے کیا خدا نے کسی انسان کو رسول بنا کر بھیجا ہے! سورہ بنی اسرائیل آیت ۹۴)



بنا کر بھیجتے۔

اسی طرح سورہ کہف آیت ۱۸ میں رسول اللہ کی انسانی حیثیت کے  
ان الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے :-

قل انما انا بشر مثلكم یوحی الی انما الھكم الھ واحد یعنی اے  
رسول کہہ دے کہ میں تمھاری ہی طرح ایک انسان ہوں اور اگر کوئی فرق  
ہے تو صرف یہ کہ خدا مجھے تمھیں وحدانیت کی تعلیم دینے کی ہدایت کرتا ہے۔

سورہ نبی اسرائیل کی آیت ۹۳ میں "هل كنت الا بشرا رسولا"  
انکہ اس کی اور زیادہ وضاحت کر دیجاتی ہے۔

جیسا کہ اس سے قبل میں نے عرض کیا ایک نبی کی خصوصیات میں  
اس کا غیب دان ہونا بھی لازمی طور پر تسلیم کیا جاتا تھا، لیکن اسلام نے  
اس کی بھی نہایت پر زور الفاظ میں تردید کی ہے۔ رسول اللہ سے ارشاد  
ہوتا ہے کہ جو لوگ تم سے اس قسم کا مطالبہ کرتے ہیں ان سے کہہ دو کہ واللہ  
غیب السموات والارض والیہ یوجع الامر کلہ، یعنی آسمان و زمین  
کی پوشیدہ باتوں کا جاننے والا صرف خدا اور وہی سب کا مرجع حقیقی  
ہے۔ (آیت ۱۲۳ - سورہ ہود)

سورہ نمل کی آیت ۶۵ میں ارشاد ہوتا ہے :- "قل لا یعلم  
من فی السموات والارض الغیب الا اللہ"

سورہ النعام کی آیت ۵۰ میں کی صراحت اور زیادہ پر زور الفاظ میں اس طرح کی جاتی ہے کہ :-

”قل لا اقول لکم عندی خزائن اللہ ولا اعلم الغیب لا

اقول لکم انی ملامت“

اے رسول کہہ دیجئے کہ میں نے یہ کبھی دعویٰ نہیں کیا کہ میرے پاس خدا کی خزانے ہیں یا میں غیب کا جاننے والا ہوں یا یہ کہ میں فرشتہ ہوں ۔  
پھر سورہ اعراف میں اس کی وضاحت دوسرے طریقہ سے یوں کی گئی ہے :-

”قل لا املک لنفسی نفعاً ولا ضرراً الا ما شاء اللہ ولو کنت

اعلم الغیب لاستکثرت من الخیر وما مستنی المسو“

یعنی مجھے اپنے نفع و نقصان پر بھی اختیار نہیں ہے اور اگر مجھے آئندہ کا حال معلوم ہوتا تو اپنے لئے سب بھلائیوں ہی بھلائیوں جمع کر لیتا اور مجھے کوئی نقصان نہ پہنچتا ۔

یہ ہیں وہ آیات قرآنی جن سے رسول اللہ کی حیثیت انسانی کو ظاہر کیا گیا ہے اور کھلے الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ آپ بھی دوسرے انسانوں کی طرح ایک انسان تھے ، نہ آپ کو آئندہ کا حال معلوم تھا نہ آپ کے پاس خزانے غیب کی کنجیاں تھیں ، یہاں تک کہ جن دنیاوی

اسبا کے ماتحت انسان کو نفع و ضرر پہنچا کرتا ہے، ان سے بھی آپ  
مشتی نہ تھے۔

ایک نبی کی ایک خصوصیت یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ وہ حامل معجزات  
ہو اور رسول اللہ سے قبل عام طور پر خوارق عادات کا ظہور اثبات  
نبوت کے لئے ضروری سمجھا تھا، لیکن کلام مجید نے اس مسئلہ کو بھی ہمیشہ  
کے لئے صاف کر دیا۔

حبس وقت کفار نے رسول اللہ سے کہا کہ ہم تجھ پر اس وقت ایمان لائیں گے  
جب تو زمین سے ہمارے لئے چشمہ جاری کر دے یا یہ کہ تیرے پاس  
کھجور اور انگور کا باغ ہو اور اس میں بہتی ہوئی نہریں نکال دے یا یہ کہ  
تو آسمان کے ٹکڑے کر دے یا یہ کہ خدا اور فرشتوں کو اپنے ساتھ لے آئے  
وغیرہ تو اس کا جواب رسول اللہ نے صرف یہ دیا کہ ”سبحان ربی  
علیٰ کنت الا بشر، سو لا“ (ملاحظہ ہو سورہ نبی اسرائیل آیات ۹۱-۹۵)  
اگر رسول اللہ حامل معجزہ ہوتے یا منصب نبوت میں معجزوں کا دکھانا  
بھی شامل ہوتا، تو اس سے زیادہ موزوں و مناسب وقت کوئی ہو ہی  
نہ سکتا تھا کیونکہ کفار اس پر صراحت کر رہے تھے اور ایسے وقت میں معجزہ کا  
اظہار از بس و مفید و کارآمد ہوتا، لیکن آپ نے نہ صرف معجزہ دکھانے سے  
انکار دیا بلکہ ان کو منصب نبوت کا صحیح مفہوم بھی سمجھا دیا کہ نبی یا رسول کو

انسانی ہستی سے بالاتر ہستی سمجھنا غلطی ہے۔  
 نبی کے متعلق یہ بھی عام اعتقاد پایا جاتا ہے کہ اس سے کوئی غلطی سرزد  
 نہیں ہو سکتی یا یہ کہ وہ خطا و نسیان سے متبرک ہے لیکن کلام مجید سے اسکی  
 بھی تردید ہوتی ہے۔

سورہ سبا کی آیت ۴۹ میں رسول اللہ سے ارشاد ہوتا ہے:-  
 ”قل ان ضللت فانا اضل علی نفسی وان اھتدیت فہما یوحی  
 الی سربانی اندر سمیع قریب“ (یعنی کہہ دو کہ اگر مجھ سے کوئی لغزش ہوتی ہے  
 تو اس کا ذمہ دار میں ہوں اور اگر سیدھی راہ اختیار کرتا ہوں تو وہ خدا کی  
 ہدایت ہے)

سورہ نومن، آیت ۵۵ میں ایک جگہ رسول اللہ سے خطاب کیا گیا ہے کہ  
 ”استغفر لذنبک و مسجح محمد سربک“ (اپنی غلطی سے توبہ کر  
 اور خدا کی حمد بیان کر)

سورہ محمد آیت ۱۹ میں پھر ”استغفر لذنبک و للمومنین  
 و المؤمنات“ کے الفاظ ارشاد ہوتے ہیں۔

سورہ فتح کی آیت ۱-۲ میں ارشاد ہوتا ہے:-  
 ”انا فتحنا لک فتحا مبینا لیغفر لک اللہ ما تقدم من ذنبک“  
 بیان بھی وہی لفظ ذنب موجود ہے۔



ایک بار رسول اللہؐ نے کسی اندھے کی بات نہ سنی اور اس سے منہ پھیر لیا۔ آپؐ کو اس طرح تنبیہ کی گئی :-

”عَبَسَ وَتَوَلَّىٰ اِنْ جَاءَهُ اِلَّا عَمٰی“ (سورہ عبس۔ آیت ۱-۲-۳)  
 سورہ برآۃ (آیت ۴۳) میں رسول اللہؐ سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ :-  
 ”عَفَا لِلّٰهِ غَنَکَ لَمَّا ذُنُوبٌ حَتٰی تَبٰیْنُ لَکَ الَّذِیْنَ

صَدَقُوْا وَتَعَلَّمَ الْکَاذِبِیْنَ“

کچھ لوگ ایسے تھے جنہوں نے بعض جنگوں میں رسول اللہؐ کا ساتھ نہ دیا تھا لیکن رسول اللہؐ نے ان کو پھر شمول جنگ کی اجازت دیدی تھی اس پر آپؐ نے کہا گیا کہ جب تک سچے جھوٹوں کی تفریق و تصدیق نہ ہوئی تھی، کیوں انہیں اجازت دینی۔

سورہ النعام کی آیت ۶۸ سے یہاں تک ظاہر ہوتا ہے کہ آپؐ سے وہ نسیان بھی سرزد ہو سکتا تھا جسے عام طور پر شیطان سے منسوب کیا جاتا ہے۔ آیات مذکورہ بالا کے مطالعہ سے دو باتیں بخوبی واضح ہو جاتی ہیں ایک یہ کہ رسول اللہؐ کی ذات لغزش، غلطی، نسیان یا بھول چوک سے مستثنیٰ نہ تھی اور دوسرے یہ کہ آپؐ کو آئندہ کا کوئی حال معلوم نہ تھا ممکن ہے

لَا وَخَا یُّرٰی الَّذِیْنَ یُخَوِّضُوْنَ فِیْ اٰیَاتِنَا فَاَعْرَضُوْا عَنْهُمْ حَتّٰی یُخَوِّضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غٰیْرَہٗ ۔ وَاَمَّا یٰۤاَیُّهَا الشَّیْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْۢ بَعْدَ الذِّکْرِۙ عَنِ الْقَوْمِ لِنَنْظُرَ

بعض حضرات اسے منصب نبوت کی توہین سمجھیں، لیکن حقیقت یہی ہے کہ رسول اللہ کی حقیقی عظمت و جلالت صرف اسی طرح ثابت ہو سکتی ہے کہ پہلے ان کو ایک انسان اور پھر نبی سمجھا جائے۔

میں کبھی اس کا قائل نہیں ہو سکتا کہ رسول کسی معصیت یا گناہ میں مبتلا ہو سکتے تھے کیونکہ گناہ کا تعلق انسان کے ارادہ اور خرابی ضمیر سے ہے اور اس میں کلام نہیں کہ جس حد تک نیت و ارادہ کا تعلق ہر ایک رسول کبھی کسی گناہ کا مرتکب نہیں ہو سکتا لیکن گناہ کے علاوہ ایک چیز اور ہے جسے انسانی لغزش، اجتہادی غلطی، نسیان، اور بھول چوک، کہتے ہیں اور اس کا امکان ہر وقت ہر انسان سے ہے۔ یہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ رسول اللہ کی ذات مرکز تھی روحانی و مذہبی تعلیم کی بھی اور سیاسی رہنمائی کی، یا با لفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ جس حد تک سب کا تعلق تھا آپ کی تعلیم وحی و الہام کے ماتحت ہوتی تھی اور اس میں کسی لغزش کا امکان نہ تھا، لیکن آپ کی سیاسی زندگی میں اس کا امکان تھا کہ آپ کبھی کوئی فرد گنہگار ہو جائے یا کوئی فیصلہ آپ لیا کریں جو مناسب نہ ہو۔ چنانچہ مذکورہ بالا بات سے اور خود سیرۃ نبوی کے بعض واقعات سے اس کی تصدیق ہو سکتی ہے، پھر جب خود ذات نبوی کے متعلق غلطی یا لغزش کا امکان تھا تو خلفاء و ائمہ یا اہلبیت کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا کہ ان سے کبھی کوئی غلطی سرزد

نہ ہو سکتی تھی؛ کیونکہ درست ہو سکتا ہے۔ اتنی بحث کے بعد جواب کا ایک یہ پہلو واضح ہو جاتا ہے کہ اگر منجانب رسول شروعاتیت جناب میر کو صحیح تسلیم کر لیا جائے۔ تو بھی اس کا امکان رہ جاتا ہے کہ رسول شرک کا یہ انتخاب موزون رہا ہو یا ایک صحابہ سے آپ کو خلیفہ نہ بنانے میں غلطی ہوئی ہو، مگر اس غلطی سے یہ نتیجہ تو نہیں نکل سکتا کہ آنھوں نے قصداً ازراہ عناد و نفاق آپ کے حقوق کو پامال کیا ہوتا، ہم میں جواب کے اس پہلو کو ترک کر کے ایک اور پہلو اختیار کرتا ہوں۔ سب سے پہلے یہ ہر تصفیہ طلب ہے کہ آیا خلافت کا مسئلہ مذہب اسلام سے تعلق رکھتا تھا یا سیاسیات اسلام سے۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ کا تعلق مذہب سے ہونا چاہیے کیونکہ رسول شرک کے بعد ان کی جانشینی کا مسئلہ کوئی معمولی مسئلہ نہ تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کو مذہب سے کوئی واسطہ نہ تھا اور نہ صولاً ہونا چاہیے بلکہ اس کا تعلق صرف سیاسیات سے تھا۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ کلام مجید میں مسئلہ میں ساکت ہے یعنی رسول شرک و وحی کے ذریعے سے کوئی ہدایت سربا میں نہیں کی گئی اور اگر اس کو واقعی کوئی مذہبی اہمیت حاصل ہوتی تو یقیناً وحی کے ذریعے اس کا فیصلہ کیا جاتا۔ اب اسی کے ساتھ واقعات و حالات پر بھی ایک نگاہ ڈالنے کے لئے کہ ان سے کیا نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ رسول اسد پر ضرور چاہتے تھے کہ ان کے بعد جناب میر

خلیفہ قرار دئے جائیں جیسا کہ آپ نے بارہا اشارتاً و کناً کیا بلکہ ایک حد تک  
 صراحتاً اس کو ظاہر بھی کیا لیکن اسی کے ساتھ چونکہ اسلام جمہوری حکومت کا حامی  
 تھا اور وہ مسئلہ نیابت کی بنیاد خاندانی یا ذاتی وجاہت پر قائم کرنا نہ چاہتا  
 تھا، اس لئے رسول اللہ کا اپنے بعد کسی کو نامزد کر جانا ر علی انخصوص اس وقت  
 جبکہ خدا کی طرف سے بھی کوئی ہدایت نہ پہنچی تھی، کوئی معنی نہ رکھتا تھا،  
 اور اس نامزدگی کی حیثیت صرف ایک ذاتی رائے کی سی تھی جس کو وحی  
 سے کوئی تعلق نہ تھا اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ یوں تو بارہا رسول اللہ  
 نے جناب امیر کو دلی، مولیٰ، وصی وغیرہ کے الفاظ سے یاد کیا لیکن جب  
 آپ کے وصال کا وقت قریب آیا تو آپ نے اس باب میں خاموشی اختیار کر لی۔  
 اس وقت کا سب سے زیادہ اہم واقعہ جس سے حضرات شیعہ خلافت جناب امیر کو  
 استدلال کرتے ہیں، واقعہ قرطاس ہے۔ اول تو اسکے وقوع میں اشتباہ ہی  
 لیکن اگر اس کو صحیح باور کر لیا جائے تو بھی اب یہ کیونکر یقین کیا جاسکتا ہے  
 کہ رسول اللہ نے خلافت و نیابت ہی کا فیصلہ کرنے کے لئے کاغذ قلم طلب  
 فرمایا تھا۔ بلکہ قیاس یہ چاہتا ہے کہ مقصد کچھ اور تھا یا اگر ہی تھا تو آپ نے  
 دوبارہ غور فرمانے کے بعد اس کو ملتوی کر دیا۔

واقعہ قرطاس کے بعد فوراً رسول اللہ کا وصال نہیں ہوا بلکہ پیش وچاس  
 کے عالم میں اتنا وقت آپ کو ملا کہ اگر آپ اس مسئلہ کا حق جناب امیر فیصلہ کرنا



چاہتے تو عملاً کر سکتے تھے اور تمام اکابر صحابہ کو بلا کر اپنے سامنے حضرت علی کے ہاتھ پر بیٹ لے سکتے تھے۔ مگر آپ نے ایسا نہیں کیا۔ اگر رسول اللہ کی یہ خواہش کسی وحی الہی کا نتیجہ ہوتی تو آپ بلا پس و پیش نہایت صاف الفاظ میں اس کا اظہار کر جاتے اور وہ الفاظ کلام مجید میں بھی ہوتے، لیکن چونکہ اس مسئلہ کا تعلق مذہب سے نہ تھا بلکہ مصلح سیاست سے تھا، اس کلام مجید میں تو اس کا ذکر ہو ہی نہ سکتا تھا اور سیاسی حیثیت سے اس کا قطعی تصفیہ رسول اللہ نے اس لئے نہ کیا کہ اول تو یہ اسلام کی روح و ستوریت کے خلاف ہوتا اور دوسرے یہ کہ آپ اچھی طرح واقف تھے کہ جناب امیر خلیفہ بن جانا آسان نہیں ہے اور ان کے اتنے مخالف موجود ہیں کہ اس پر ہمارا کرنا سخت فتنہ و فساد کا باعث ہوگا۔

شیعی روایات کے لحاظ سے رسول اللہ کے وصال کے بعد حضرت علی کے طرفداروں میں صرف تین شخص تھے (سلمان انصاری - ابوذر - المقداد بن الاسود الکندی) اگر واقعی تمام ہاجرین و انصار و اکابر عرب میں سے صرف تین شخص (بعض شیعہ روایات کے مطابق دو چار اور) جناب امیر کے طرفدار تھے اور باقی سب مخالف تو یقیناً آپ خلافت کے لئے نامزد ہو ہی نہ سکتے تھے اور اگر اس کی کوشش کی جاتی تو بھی کامیابی کی کوئی توقع نہ تھی ممکن ہے کہ رسول اللہ نے انہیں حالات کو دیکھ کر خود وقت میں سکوت فرمایا اور

اور اس کا فیصلہ مستقبل پر چھوڑ دیا ہوا اس میں شک نہیں کہ رسول اللہ نے اپنی خواہش کا اظہار تو اپنی زندگی میں کر دیا تھا لیکن یہ آپ کی ایک اے لکھی حکم نہ تھا، آپ کی ذاتی خواہش تھی، فرمان خداوندی نہ تھا، گویا دوسرے الفاظ میں یون کہے کہ رسول اللہ کا حضرت علی کو ولی و وصی وغیرہ کے الفاظ سے یاد کرنا صرف یہی معنی رکھتا تھا کہ اگر ان کے بعد خلافت کے لئے انتخاب عمل میں آئے تو ان کی رائے حضرت علی کے حق میں شمار کی جائے پھر یہ بھی آپ کی انتہائی فراست تھی کہ وصال کے وقت آپ نے اپنی جانشینی کا مسئلہ نہیں فرمایا اور نہ ممکن ہے وہ فتنہ و فساد جو حضرت عثمان کے بعد شروع ہوا، آپ کے وصال کے بعد ہی برپا ہو جاتا اور اسلام کی عمر اور زیادہ نا پائدار ثابت ہوتی۔

اب ایک صورت اور اس مسئلہ پر غور کرنے کی ہے یعنی یہ کہ خود حضرت علی کے طرز عمل سے ہم کو کیا بات ظاہر ہوتی ہے۔ حضرات شیعہ کا اعتقاد ہے کہ ولایت و وصایت جناب امیر کا اعلان رسول اللہ نے حسب فرمان خداوندی کیا تھا یعنی نص قرطبی سے آپ کی ولایت ثابت ہوتی ہے۔ در انجا ایک کلام مجید میں کوئی آیت اس کی تائید میں نہیں ملتی، لیکن اگر یہ کہا جائے کہ رسول اللہ کا یہ ارشاد ہی نص قرطبی یا وحی متلو کی حیثیت رکھتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ کے تمام اقوال کو وحی متلو نہ سمجھا جائے اور حدیث و قرآن کے امتیاز کو اٹھا دیا جائے

حالانکہ حضرات شیعہ بھی قرآن و حدیث میں یہی وجہ امتیاز قائم کرتے ہیں کہ ایک وحی مشکوہ ہے اور دوسری وحی غیر مشکوہ یعنی ایک کا تعلق فرمانِ خداوندی سے ہے اور دوسرے کا رسول اللہ کی ذاتی رائے سے۔ ہم اس سے قبل ظاہر کر چکے ہیں کہ اس مسئلہ کا تعلق چونکہ نفسِ مذہبی کے نہ تھا بلکہ سیاسیات سے تھا اسی لئے کوئی وحی مشکوہ (قرآن مجید کے اندر) اس باب میں نہیں پائی جاتی اور اگر حضرات شیعہ کے قول کو صحیح باور کیا جائے تو ہم کو حسبِ دلیل باتین معارض نظر آتی ہیں۔

(۱) اگر خلافت جناب امیر کے متعلق کوئی نص قطعی موجود ہوتی تو اسے کلامِ مجید میں ہونا چاہیے تھا حالانکہ نہیں ہے۔

(۲) اگر واقعی فرمانِ خداوندی ایسا ہی ہوتا جیسا کہ حضرات شیعہ سمجھتے ہیں تو علاوہ اس کے کہ دیگر احکام کی طرح نہایت صاف و واضح الفاظ میں اس کا ذکر کلامِ مجید میں ہوتا، رسول اللہ خود اپنے سامنے ہی حضرت علی کی باقاعدہ خلافت سب لوگوں سے تسلیم کر کے رخصت ہوتے، حالانکہ یہ بھی تاریخ سے ثابت نہیں۔

(۳) اگر یہ کوئی خالص مذہبی مسئلہ ہوتا تو ظاہر ہے کہ حضرت علی ضرور اس سے واقف ہوتے اور چونکہ وہ احکامِ مذہبی کے نہایت سخت پابند تھے اس لئے باوجود تمام مخالفتوں کے اپنی خلافت کی کوشش ضرور کرتے۔

لیکن جب آپ کو معلوم ہوا کہ حضرت ابو بکر کے ہاتھ پر لوگوں نے بیعت کر لی  
 تو آپ خاموش ہو رہے۔ ہم تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کئے لیتے ہیں کہ آپ نے خود  
 حضرت ابو بکر کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی، لیکن آپ کا اس بیعت کو گوارا  
 کر لینا اسی سے ظاہر ہے کہ آپ صحابہ کے تمام مشورون میں شریک ہوتے تھے  
 اور اکثر آپ کی رائے پر عمل بھی کیا جاتا۔ اگر حضرت علی حضرت ابو بکر کو صیب  
 حلیفہ سمجھتے یا ان کی خلافت آپ کے نزدیک خلافتِ منشاءِ خداوندی ہوتی  
 تو کم از کم آپ یہ ضرور کرتے کہ ان سے ہمیشہ کے لئے کٹ کر علیحدہ ہو جاتے  
 اور مراسمِ موالات ترک کر دیتے، اگر جنگ کرنا مناسب نہ تھا۔ ممکن ہے کہ  
 آپ نے مصلحتاً اس کو اس خیال کی بنا پر گوارا کر لیا ہو کہ حضرت ابو بکر ضعیف  
 ہیں اور جب چند دن بعد ان کا انتقال ہو جائے گا تو پھر خلافت ان کو  
 ملے ہی گی، لیکن حضرت ابو بکر کے بعد بھی ان کو اس کا موقعہ نہیں دیا جاتا  
 اور وہ حضرت عمر کے دورِ خلافت میں بھی اسی ردِ اداوری و موالات سے کام  
 لیتے ہیں۔ حتیٰ کہ حضرت عمر کے بعد حضرت عثمان کا زمانہ آتا ہے اور حضرت علی  
 بدستور نہ صرف خاموش رہتے ہیں بلکہ ان کی بھی مدد کرتے ہیں۔ اگر یہ تمام  
 زمانہ واقعی عاصبانہ دورِ خلافت کا تھا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ ایسا مبغوض  
 عہد تھا جس سے نہ خدا خوش ہو سکتا تھا نہ اس کا رسول، لیکن حیرت ہے  
 کہ جنابِ امیر نے اپنی عمر کا بڑا حصہ اس غیر اسلامی زمانہ کا ساتھ دینے میں



بسر کر دیا اور انھوں نے کبھی کوئی صدائے احتجاج بلند کی اور نہ منشا خدا و رسول کو پورا کرنے کی کوشش کی۔

حضرت علی اپنے اخلاق کی مضبوطی، اپنی غیر معمولی شجاعت و بہادری، اپنی اسلامی محبت، اپنی جذبہ فدویت و قربانی کے لحاظ سے اتنے غیر معمولی انسان تھے کہ کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی ان کے متعلق یہ خیال نہیں ہو سکتا کہ محض کسی دنیاوی مصلحت کی بنا پر دینی احکام کی پابندی میں انھوں نے کبھی تسامح سے کام لیا ہو۔ اس لئے حضرت علی کا خلفاء ثلاثہ کے زمانہ میں حد درجہ میں پسندانہ زندگی بسر کرنا اور سب کے ساتھ صلاح و مشورہ میں شریک ہونا سوائے اسکے اور کسی سبب کی بنا پر نہیں ہو سکتا تھا کہ آپؑ خلافت کو خالص مذہبی مسئلہ نہ سمجھتے تھے بلکہ اس کو سیاسی معاملہ جان کر واقعات و حالات کے لحاظ سے اپنی خلافت پر زور دینا یا اس کے لئے کوشش کرنا مناسب خیال نہ فرماتے تھے۔

اس سے قبل ہم خود بھی روایات کی بنا پر یہ ظاہر کر چکے ہیں کہ رسول اللہؐ کی وفات کے بعد صرف انگلیوں پر گنے جانے والے چند نفوس حضرت علیؑ کے طرفداروں میں پائے جاتے تھے اور چونکہ آپؑ خود بھی اس کو جانتے تھے کہ لوگ ان کی خلافت تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہوں گے۔ اس لئے سیاسی مصالح کے لحاظ سے آپؑ کبھی اس کی خواہش نہیں کی اور رائے عامہ کے خلاف

کبھی کوئی قدم ایسا نہیں اٹھایا جو فتنہ و فساد کا باعث ہوتا۔ حضرات  
شیعہ خباب میر کے اس سکوت کو جس چیز سے چاہیں تعبیر کریں۔ لیکن میں  
اس کا سبب صرف یہ قرار دیتا ہوں کہ آپ صحیح معنی میں تعلیمات اسلام کے  
مقصد سے واقف تھے اور روح دستوریت یا رائے عامہ کے منافی کوئی  
کام کرنا مناسب نہ سمجھتے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ خلفاء راشدہ کی خلافت کا مسئلہ رائے عامہ جاہل  
کرنے کے بعد طے نہیں کیا گیا۔ خیر خلیفہ اول کے متعلق تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ  
وقت نازک تھا اور اگر رائے عامہ جاہل کرنے کی کوشش کی جاتی تو اس  
تعلیق سے خرابیاں پیدا ہونیکا اندیشہ تھا۔ لیکن حضرت عمر اور حضرت عثمان  
کی خلافت کے وقت یہ سبب بھی پیدا نہیں تھا اور یقیناً انکی خلافت نامزدگی  
کی صورت سے ہوئی جو تعلیمات اسلامی کے منافی تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ  
ابھی تک عربوں میں اتنی صلاحیت پیدا نہ ہوئی تھی کہ وہ انتخاب حکمران کے  
مسئلہ میں صحیح معنی میں دستوری حکومت کے نقطہ نظر کو سمجھ سکتے علاوہ اس کے  
جن ذاتی اثرات کے ماتحت یہ حضرات خلیفہ تسلیم کئے گئے وہ غالباً ایسے تھے  
کہ اگر رائے عامہ جاہل کی جاتی تو بھی شاید نتیجہ یہی نکلتا، لیکن اگر تھوڑی دیر  
کے لئے تسلیم کر لیا جائے کہ نتیجہ کچھ اور پیدا ہوتا تو اب اس سے بحث فضول  
ہے کیونکہ اس کا تعلق مذہب سے تھا ہی نہیں اور جو کچھ ہوا وہ سب سیاسی

مصلح با سیاسی اخلاقات سے متعلق تھا۔ جب غیر مذہبی معاملات میں لغزش و غلطی کا امکان رسولِ شہر سے بھی تھا تو خلفاء کا کیا ذکر ہے ؟

اس سلسلہ میں ایک امر اور قابلِ غور رہنما ہے وہ یہ کہ حضرت علی کے طرفدار اتنے کم کیوں تھے اور ان کی خلافت کی راہ میں کونسے اسباب تباہ تھے۔ رسولِ امیر کو جو تعلق جنابِ امیر کی ذات سے تھا وہ کسی سے منفی نہیں۔ اور جو خدمات آپؐ نے انجام دیں وہ بھی سب پر عیان ہیں۔ رسولِ شہر کو آپ سے عشق تھا اور آپ بھی رسولِ شہر کے ایسے فدائی تھے کہ کوئی دوسرا اس باب میں ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ پھر یہ فطرت انسانی ہے کہ جب ایک محبوب متعدد چاہنے والے ہوتے ہیں تو ان میں سے ہر ایک اپنا ہی درجہ حاصل کرنا چاہتا ہے اور اگر اسے کسی خاص شخص سے زیادہ تعلق ہو جاتا ہے۔ تو دوسروں کو اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ رسالتِ حبس خصوصیت کا اظہار جنابِ امیر سے کیا کرتے تھے، اسے فطرتاً ہی صحابہ کے لئے باعثِ رشک ہونا چاہیے تھا اور غالباً حقیقت سے انکار ہو گا اگر یہ کہا جائے کہ جو عزت جنابِ امیر کی رسولِ شہر کے دل میں تھی بالکل وہی دوسروں کی نگاہ میں تھی،

اس کے علاوہ حضرت علی کی طرف سے ایک عام جذبہ ناپسندیدگی کا سبب یہ بھی تھا کہ غزوات میں سب سے زیادہ آپ ہی نے دشمنوں کو قتل کیا تھا اور شاید ہی کوئی خاندان یا قبیلہ ایسا ہو جو متاثر نہ ہوا ہو۔ ہر خندہ

جو کچھ ہوا سب اسلامی نقطہ نظر سے تھا اور اس میں ذاتی اغراض و مقاصد کا  
 مطلقاً کوئی لگاؤ نہ تھا، لیکن اہل عرب اپنی کینہ پرور طبیعت کی وجہ سے مجبور  
 تھے اور یہ کانٹا ان کے دل سے کسی طرح نہ نکلتا تھا۔ آپ رسول اللہ کے بھائی  
 تھے، داماد تھے، لیکن عربوں کی نگاہ میں بیٹی داماد کا رشتہ کوئی ایسا رشتہ  
 نہیں سمجھا جاتا تھا کہ رسول اللہ کے بعد اس کا کوئی اثر پڑ سکتا۔ یہ نسبت  
 ایام جاہلیت کے عہد اسلام میں عورت کی معاشری سطح کا فی بلند ہو گئی تھی لیکن  
 نہ اتنی کہ ایک بیوی کے ہوتے ہوئے بغیر کسی عذر صحیح کے دوسری شادی کرنا  
 معیوب سمجھا جاتا یا یہ کہ طلاق دینے میں کچھ پس و پیش کیا جاتا۔ شادی کرنا اور  
 بیوی کو چھوڑ دینا ان کا روزگار کا مشغلہ تھا اور وہ تعلقات جو نکاح کے سلسلہ میں  
 قائم ہو کرتے تھے صرف وقتی اہمیت رکھتے تھے، اور ان کا کوئی پائدار اثر  
 نہ ہو کرتا تھا۔ اس لئے حضرت علی کا داماد ہونا، اہل عرب کے نزدیک کوئی  
 ایسی بات نہ تھی جس کا کوئی وزن ہوتا، رہ گیا رسول اللہ کا اپنی زندگی میں  
 بارہا جناب امیر کی خدمات کو غیر معمولی طور پر سراہنا اور ان کو مولیٰ، وصی،  
 یا ولی کے الفاظ سے یاد کرنا، سو اس کو کوئی مذہبی اہمیت تو دی نہیں گئی  
 اور نہ دنیا چاہیے تھی۔ اس سے الٹا نقصان یہ ہوا کہ لوگ آپ سے زیادہ جلنے  
 لگے اور رسول اللہ کے وصال کے بعد آپ کے مخالفین کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ  
 حضرات شیعوہ کے قول کے مطابق سو اسیے دو چار آدمیوں کے اور کوئی



طرفدار آپ کا نہ تھا۔

اس میں شک نہیں کہ تاریخ اسلام کا یہ عہد درجہ درزاک واقعہ ہے کہ رسول اللہ کی آنکھ بند ہوتے ہی آپس میں اختلافات شروع ہو گئے لیکن ایسا ہونا لازم تھا، کیونکہ جس وقت تک رسول اللہ زندہ رہے اس وقت تک تو خیر کسی کو چون و چرا کا موقعہ ہی نہ تھا۔ مذہب و سیاست دونوں کی باگ آپ کے ہاتھ میں تھی لیکن آپ کے بعد ان دونوں میں تفریق ہو جانا اور مختلف سیاسی اداروں کا قیام بالکل قدرتی امر تھا کیونکہ وحی کا دروازہ بند ہو چکا تھا اور کوئی ایسا شخص موجود نہ تھا جو باہمی اختلافات کی صورت میں کسی خدائی فیصلہ کا اعلان کر کے سب کو خاموش کر سکتا۔

اس لئے رسول اللہ کے بعد مسئلہ خلافت میں تین جماعتیں تین مختلف رہن رکھنے والی پیدا ہو گئیں ایک شعی جماعت جو اس بات کی قائل ہے کہ خلافت کے اولین حقدار جناب امیر تھے اور اہلبیت ہی میں اس سلسلہ کو قائم رہنا چاہیے یعنی سوائے آل رسول کے کوئی اور مستحق امانت و خلافت نہیں ہے، دوسری جماعت خارجیوں کی، جو اس مسئلہ کو کوئی اہمیت نہیں دیتے اور ان کے نزدیک ایک حبشی غلام بھی خلیفہ ہو سکتا ہے اگر وہ اس کا اہل ہے تیسری جماعت سنیوں کی ہے جنہوں نے بین بین راستہ اختیار کیا لیکن حقیقتاً وہ کچھ نہ تھایں تودہ اس امر کے قائل ہیں کہ خلافت خاندان قریش کے لئے

مخصوص ہے لیکن عملاً انھوں نے ترک فرمانرواؤں کو بھی خلیفہ تسلیم کیا جن میں قریش کیا عرب کے کسی خاندان سے دور کا بھی تعلق نہ تھا۔

حضرات شیوہ اس باب میں جن احادیث سے استناد کرتے ہیں ان سے اہمیت کے مرتبہ کی بندی ضرور ظاہر ہوتی ہے لیکن میں یہ کہہ بھی ماننے کے لئے طیار نہیں ہو سکتا کہ اسلام جس نے جمہوریت کی بنیاد دنیا میں قائم کی وہ ہنقدر تنگ نظر ہو سکتا ہے کہ سیادت و قیادت کو ابد الابد تک صرف رسولؐ کے خاندان کے لئے مخصوص کر دے۔ مذہب اسلام کی خصوصیت اس کا جذبہ مساوات ہے یعنی وہ رنگ و نسل کا امتیاز مٹا کر تمام انسانوں کو ایک سطح پر لانا چاہتا ہے اور وہ سطح صرف بندی اخلاق کی ہے۔ اس لئے امامت و خلافت کو آل رسولؐ کے لئے مخصوص کر دینا یعنی رکھنا ہے کہ رسول اللہؐ نے بجائے جذبہ جمہوریت کے شخصی و استبدادی حکومت کی حمایت کی، جو قطعاً روح اسلام کے منافی ہے، سنیوں کا طرز عمل اس باب میں قطعاً غیر فیصلہ کن ہے وہ ایک طرف شیعوں کے بھی ہمنوا ہیں اور دوسری طرف خارجیوں کے بھی یہاں غالباً اس بحث کا نہ موقع ہے نہ ضرورت کہ ان تینوں میں کس جماعت کی رائے جمہوریت اسلام کے مفہوم کے لحاظ سے زیادہ قابل قبول ہے لیکن ان تینوں جماعتوں کی تاریخ پر نگاہ ڈال کر یہ فیصلہ کرنا ضروری ہے کہ کس کو کب مذہبی حیثیت دی گئی اور اتحاد اسلامی کو سب سے زیادہ نقصان

کس جماعت سے ہونچا۔

۱۱) جس حد تک مذہب و اتحاد اسلامی کا تعلق ہے، اہل سنت قطع نظر اس سے کہ وہ یقین خلافت کے مسئلہ میں حق پر ہیں یا نہیں، بڑی حد تک محفوظ ہیں کیونکہ خلافت کے مسئلہ کو سب سے پہلے جماعتی و مذہبی حیثیت سے دیکھنے والی وہی جماعت ہے۔ رسول اللہ کا انتقال ہوتا ہے، ایک جماعت حضرت ابو بکر کے ہاتھ پر بیعت کرتی ہے جس کے اتباع میں سب لوگ (سوائے چند افراد کے) ایک مرکز پر جمع ہو جاتے ہیں اور اس طرح اس سیاسی فیصلہ کو مذہبی حیثیت دیکر اتحاد و اجتماع کی ایک معقول صورت دیتے ہیں۔ ممکن ہے حضرت علی نے اس کو پسند نہ کیا ہو لیکن انھوں نے بھی اس جماعتی فیصلہ کا کافی احترام کیا، اور اپنے حق خلافت کو نظر انداز کر دیا۔ اس وقت ایک مختصر سی جماعت چند افراد کی ضرورت سی تھی جو اس فیصلہ سے خوش نہ تھی لیکن اس کو کوئی جدا گانہ مذہبی حیثیت حاصل نہ تھی بلکہ اسے ایک مختصر سیاسی ادارہ کہنا چاہیے جس کو ممکن ہے حضرت علی کی دلی حمایت حاصل رہی ہو لیکن عملی حیثیت سے آپ نے کبھی اس کا ساتھ نہیں دیا۔

ہو سکتا ہے کہ اس جماعت نے یہ خیال کیا ہو کہ حضرت ابو بکر کے بعد تو سوائے حضرت علی کے کوئی دوسرا خلیفہ ہو ہی نہیں سکتا اس لئے چند دن اور انتظار کر لیا جائے، لیکن اتفاقاً کئے یا فریق ثانی کا حسن تدبیر حضرت

علی کو پھر بھی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ ظاہر ہے کہ اس دوبارہ ناکامی سے طرنداران  
 علی کو زیادہ صدمہ پہنچا چاہیے تھا اور پونچا، لیکن حضرت علی نے پھر بھی اتحاد  
 اسلامی کے مقصد کو سامنے رکھ کر اس جماعت کو اکھٹے کرنے کا موقع نہ دیا تیسری  
 بار حضرت عثمان کی نامزدگی خلافت کے وقت پھر ہی ناکامی سے سامنا ہوا اور  
 حضرت علی نے پھر ہی صبر و سکون سے کام لیا۔ الغرض تینوں خلفاء کے دور میں  
 طرنداران علی کی جماعت کو صرف ایک سیاسی فریق کی سی حیثیت حاصل تھی  
 اور اس نے کوئی مذہب کی صورت اختیار نہ کی تھی۔ جب حضرت علی کا دور خلافت  
 آیا اور آپ کے ہاتھ پر جمہور نے بیعت کی تو پھر طرنداران وغیر طرنداران علی کا  
 کوئی سوال ہی باقی نہ رہا تھا کہ اس کی بناء پر کوئی مذہبی تفریق قائم ہو سکتی۔  
 لیکن جس زمانہ میں آپ نے منصب خلافت قبول کیا، وہ ایسا نازک پریشوار  
 زمانہ تھا کہ مذہبی تفریق سے زیادہ خطرناک سیاسی تفریق پیدا ہو گئی تھی  
 اور حضرت عثمان کی وجہ سے جو غیر معمولی اقتدار بنو امیہ کو حاصل ہو گیا تھا  
 اس نے بجائے مذہب اسلام کے حکومت اسلام کی بنیاد ڈال کر اتحاد اسلامی  
 کے شیرازہ کو منتشر کر دیا تھا لیکن ہر تار تار مکان میں تھا جناب امیر نے  
 اسلام کی مذہبی روح کو قائم رکھنے کی کوشش کی اور شاید وہ پوری طرح  
 اس میں کامیاب ہو جاتے اگر جنگ صفین میں فریق ثانی کی سیاسی چال  
 کامیاب نہ ہو جاتی۔



امیر معاویہ بظاہر بیعت سے انکار تو نہ کرتے تھے لیکن حقیقتاً وہ خود اپنی حکومت قائم کرنا چاہتے تھے اور اسکے لئے یہاں بیٹھ کر پہلے قاتلان عثمان انکے حوالہ کر دئے جائیں اسکے بعد وہ بیعت کرینگے حضرت علی اس مطالبہ کو پورا نہ کر سکتے تھے کیونکہ قاتلان عثمان کی تعیین اور انکے خلاف شرعی ثبوت کی فراہمی ممکن نہ تھی، آخر کار اسی بات پر حضرت علی اور امیر معاویہ میں جنگ ہوئی جو جنگ صفین کے نام سے مشہور ہے، اس جنگ کا سلسلہ کئی مہینے تک قائم رہا اور ہمیں شک نہیں کہ حضرت علی کی کامیابی کا نااہل بھی تھا، لیکن عمر و ابن العاص کے مشورہ سے امیر معاویہ نے نیردن پر کلام مجید بلند کر کے مصالحت کی گفتگو شروع کر دی اور جن لوگوں پر فیصلہ کا انحصار رکھا گیا تھا انھوں نے حکم کھلا امیر معاویہ کا ساتھ دے کر دفعۃً تاریخ اسلام کے رخ کو پلٹ دیا۔ اس کا ایک خراب نتیجہ تو یہ ہوا کہ حضرت علی کی فوج میں سے ایک جماعت اس گفتگو سے مصالحت سے برہم ہو کر علیحدہ ہو گئی (جسے خوارج کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے) اور اس نے اپنی بغاوتوں سے اتحاد اسلامی کو جس قدر نقصان پہونچایا وہ اہل تاریخ سے مخفی نہیں ہیں اب تک کہ حضرت علی کی شہادت بھی اسی جماعت کے ایک فرد کے ہاتھ سے ہوئی۔ دوسرا نقصان یہ ہوا کہ امارت و حکومت خاندان بنی امیہ میں منتقل ہو گئی اور اسلام میں ملوکیت کی بنیاد ڈر گئی جو قطعاً تعلیمات اسلام کے منافی تھی لیکن با این ہمہ طرفداران علی نے ابھی تک کوئی علیحدہ مذہبی حیثیت قائم نہیں کی اور تمام

اختلافات پرستور سیاسی حیثیت اختیار کئے رہے۔ اس کے بعد جب امام حسن کا انتقال ہوا جس کو ”شہادت“ کہا جاتا ہے تو علوین کے جذبات اور زیادہ مشتعل ہوئے اور اس کا رجب امام حسین کا مشہور واقعہ قتل کر بلا میں پیش آیا۔ تو صورت ناقابل برداشت ہو گئی اور اس وقت کی تمام ناکامیوں کا احساس اتنا شدید ہو گیا کہ طرفداران علی کی سیاسی تحریک نے مذہبی صورت اختیار کر لی اور وہ مطالبات جو پہلے صرف سیاسی حیثیت رکھتے تھے انھوں نے مذہبی رنگ اختیار کر لیا، اور مسئلہ امامت اس حد تک جزو ایمان قرار پا گیا کہ جب تک کوئی اسے تسلیم نہ کرے نجات اخروی ناممکن ہے۔ اس سے ایک نقصان تو ان کو یہ ہو چکا کہ سیاسی مرکز بیت ختم ہو گئی اور دوسرا یہ کہ مذہبی حیثیت سے ”امام و امامت“ کی تعبیر میں اتنی مختلف کی گئیں کہ مذہبی یکجہتی بھی قائم نہ رہ سکی اور شدید جماعت اپنے عقائد کے لحاظ سے پارہ پارہ ہو گئی۔

ان کا ایک گروہ جو زیدی کہلاتا ہے وہ امام کو اس دنیا کا ایک انسان سمجھ کر اسکی رہنمائی کا قائل ہوا،

دوسرا گروہ امامی دبی زبان سے حلول کو بھی تسلیم کرنے لگا۔ اور تیسرا گروہ جو غلاة کے نام سے موسوم ہے، کھلم کھلا امام کو خدا کا ایک جزو بلکہ عین خدا کہنے لگا۔ پھر اس کے بعد جو انتصابات ان میں پیدا ہوئے

ان کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ طبرستان و دیمین جو ریاستیں زیدیوں کی قائم ہوئیں وہ کمین کی زیدی ریاست سے بوجہ بعد متحد الخیال نہ ہو سکیں اور عراق کے زیدی چونکہ دارالحکومت سے قریب تر تھے اس لئے انھوں نے نقتیہ یا کتمان کو بھی اپنے عقائد میں شامل کر لیا۔

غلامہ میں بہ لحاظ عقائد جو تفریق پیدا ہوئی وہ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن مطہ۔ اسماعیلی، نصیری، علی اللہی سب اس جماع کے مختلف گروہوں نے قائم ہیں اور پھر ان میں سے بعض جماعتیں ایسی رہنما ہوئیں جنھوں نے امامت کے لئے اہلبیت ہونا بھی ضروری قرار نہیں دیا مثلاً کلبیانی جو محمد بن اسخفیہ کی امامت کے قابل ہیں یا حرونی جو فضل اللہ استرآبادی کو امام مانتے ہیں شیعیان علی میں سب سے زیادہ اہم جماعت وہ ہے جو امامیہ کے نام سے موسوم ہے، لیکن اس میں بھی وہی اختلاف خیال نظر آتا ہے۔

ابتداء عہد اسلام یا خلفاء اربعہ کے وقت میں منصب امامت کیلئے جو قاعدہ مقرر تھا (خواہ اس کی پابندی کی گئی ہو یا نہ کی گئی ہو) یہ تھا کہ اس کا انتخاب جمہور کی رائے سے کیا جائے۔ (بعد کو خواجہ نے بھی یہی اصول اختیار کیا) رائے دہندگان کے لئے تین شرطیں تھیں۔ ایک کہ وہ ثقہ ہو دوسرے یہ کہ شریعت سے آگاہ ہو اور تیسرے یہ کہ اس کی قوت فیصلہ و انتخاب صحیح ہو۔

امید دار امامت کے لئے حسب ذیل صفات ضروری خیال کی گئیں۔  
 (۱) ثقہ ہو (۲) شریعت کا اجتہادی علم رکھتا ہو (۳) فصیح و بلیغ  
 ہو (۴) سماعت و بینائی اور اعضا جسمانی میں کوئی نقص نہ ہو (۵)  
 معاملات کے سمجھنے اور فیصلہ کرنے کی اہلیت رکھتا ہو (۶) جہاں کی سمیت  
 و جرات اس میں پائی جائے (۷) قریش میں سے ہو۔ حضرات شیعہ بیان  
 سب سے زیادہ ضروری شرط یہ ہے کہ وہ المہبت یعنی حضرت علی اور خباب  
 فاطمہ کی اولاد میں سے ہو۔

حضرت علی کی امامت کو ”وہ نص قطعی“ کے ماتحت قرار دیتے ہیں  
 اور آپ کے بعد امام حسن کی امامت کے قابل ہیں کیونکہ حضرت علی کے بڑے  
 بیٹے دہی تھے اور ان کے خیال کے مطابق جناب امیر کے نامزد کئے ہوئے  
 بھی تھے۔ اگر جناب فاطمہ کے صرف ایک ہی بیٹا ہوتا تو راستہ صاف  
 تھا لیکن چونکہ آپ کے دو جنزادے تھے، اس لئے امام حسن کے بعد اختلاف  
 پیدا ہونا قدرتی امر تھا، کیونکہ المہبت ہونے کی حیثیت سے جس طرح امام حسین  
 کی اولاد مدعی امامت ہو سکتی تھی بالکل اسی طرح امام حسن کی اولاد بھی، لیکن  
 ایک بڑی جماعت نے امام حسن کے بعد ان کی اولاد کو اس منصب کا مستحق نہیں  
 جانا اور امام حسین کے خاندان میں اس کو منتقل کر دیا۔ اس کا ایک سبب  
 یہ تھا کہ امام حسن نے بحق امیر معاویہ دعوائے خلافت سے دستبردار ہو کر



شیعیان علی یا مخالفین بنی اسیہ کی بڑی جماعت کو برہم کر دیا تھا، دوسرے یہ کہ  
 امام حسین رسولِ بشر سے قریب تر رشتہ رکھنے کی وجہ سے زیادہ اہل امامت کے  
 تھے اور تیسرے یہ کہ (بروایت اہل شیعہ) امام حسن ان کو نامزد بھی کر گئے  
 تھے علاوہ اسکے امام حسین کی زندگی میں واقعہ کربلا ایک ایسا اہم واقعہ  
 رہا ہوا کہ اگر امام حسن کی اولاد میں کوئی دعویٰ خلافت و امامت ہوتا  
 بھی تو امام حسین کی اولاد کے مقابلہ میں انھیں کون پوچھتا علی الخصوص اسی  
 حالت میں کہ ان کے بیٹے امام زین العابدین (یزید گرد) شاہ ایران کی بیٹی  
 کے بطن سے تھے اور امام حسن کی کوئی بیوی اس مرتبہ کی نہ تھی۔

الغرض امامیہ جماعت کی مہتم بالشان شاخ وہی ہے جو سلسلہ امام حسین  
 کی اولاد میں سلسلہ امامت کی قابل ہے اور اثنا عشری کہلاتی ہے۔ رسولِ بشر  
 کے بعد ان کے بارہ اماموں کے نام سلسلہ وار یہ ہیں۔

- (۱) حضرت علی رضی (۲) امام حسن المجتبیٰ (۳) امام حسین الشہید۔
- (۴) امام زین العابدین (۵) امام محمد باقر (۶) امام جعفر الصادق
- (۷) امام موسیٰ کاظم (۸) امام علی رضا (۹) امام محمد تقی (۱۰) امام علی نقی
- (۱۱) امام حسن العسکری (۱۲) محمد المہدی

لیکن اہلبیت میں سلسلہ امامت کی قابل جماعت کبھی کسی ایک خیال پر  
 قائم نہ رہی اور متعدد مختلف خیال گردہ اس میں قائم ہو گئے بعض اختلافات

ذیل میں درج ہیں :-

(۱) امام حسن العسکری کا انتقال نہیں ہوا بلکہ آپ غائب ہو گئے ہیں اور پھر ظاہر ہوں گے۔

(۲) امام حسن بغیر اولاد چھوڑے ہوئے وفات کر گئے لیکن آپ پھر زندہ ہو کر ظہور کریں گے۔

(۳) امام حسن نے اپنے بعد اپنے بھائی جعفر کو خلافت کے لئے نامزد کیا تھا

(۴) جعفر نے اپنے بعد کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔

(۵) حضرت علی کے بعد ان کے بیٹے محمد اکشفیہ امام تھے۔

(۶) امام حسن کے ایک لڑکا آپ کی وفات سے دو سال قبل ہوا تھا

جس کا نام محمد تھا۔

(۷) امام حسن کے ایک لڑکا ضرور تھا لیکن وہ آپ کی وفات کے

۸ ماہ بعد پیدا ہوا۔

(۸) امام حسن چونکہ لا ولد تھے اس لئے دنیا امام سے خالی ہو گئی۔

(۹) امام حسن کے ایک بیٹا تھا لیکن اس کا حال معلوم نہیں۔

(۱۰) امام کا پاپا جانا ضروری ہے لیکن یہ ہمیں معلوم کہ وہ اولاد

امام حسن میں سے ہے یا نہیں۔

(۱۱) سلسلہ امامت امام علی رضا پر ختم ہو گیا اور آخری امام کا ہنوز انتظار ہے۔

- (۱۲) سلسلہ امامت امام موسیٰ کاظم پر ختم ہو گیا۔
- (۱۳) امام موسیٰ کاظم کے بعد امامت آپ کے بیٹے جیسے احمد کی طرف منتقل ہوئی نہ کہ امام علی رضا کی طرف۔
- (۱۴) امام علی رضا کے بعد ان کے بیٹے محمد بہت چھوٹے تھے اس لئے امامت کی تعلیم و داپنے باپ کے حامل نہیں کر سکے۔
- (۱۵) امام محمد تقی کے بعد بجائے علی نقی کے موسیٰ مستحق خلافت تھے
- (۱۶) امام علی نقی کے بعد بجائے حسن عسکری کے دو سب سے بڑے جعفر کا امام ہونا چاہیے۔
- (۱۷) امام حسن عسکری نے اپنے بعد کوئی اولاد نہیں چھوڑی اس لئے امامت کا سلسلہ موقوف ہو گیا۔
- (۱۸) امام جعفر عسکری کا ایک لڑکا جعفر نامی کسی کنیز سے تھا، اس لئے آپ کے بعد سے امام ہونا چاہیے۔
- یہ اور اسی قسم کے اور بہت سے اخلاقات تھے جن کی بنا پر کوئی جماعت شیعہ کے نام سے موسوم ہوئی اور کوئی قطعہ کے نام سے، کوئی واقفہ کملائی اور کوئی حارثیہ، کسی نے جعفریہ کا لقب اختیار کیا اور کسی نے اسماعیلیہ۔
- الغرض جب تک خبیثہ جماعت صرف ایک سیاسی ادارہ کی حیثیت اختیار کئے رہی، اس میں ایک نوع کا اتحاد بھی پایا جاتا تھا، لیکن جب حضرت علی

کی شہادت کے بعد اس کو مذہبی رنگ میں پیش کیا گیا تو وہ ایک جہتی بھی مفقود ہو گئی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کبھی کوئی خالص شیعہ حکومت قائم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ یہاں تک کہ مغرب میں فاطمی حکومت کو بھی ہم شیعہ حکومت اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ ملک کے تمام افراد سنی تھے۔

بحث کے اس حصہ سے میرا مقصود یہ دکھانا تھا کہ شیعہ تحریک یا تبدل میں نہ کوئی مذہبی تحریک تھی اور نہ اصولاً اسے مذہب اسلام سے علیحدہ کیا جاسکتا ہے لیکن بعد کو اسے مذہب کے رنگ میں پیش کر کے محض سیاسی غرض کی بنا پر اسلام کے دو ٹکڑے کر دئے گئے۔

اسلام نام ہے صرف اعتراف وحدانیت و اقرار نبوت کا، اس میں نہ خلافت و امامت شامل ہیں نہ کوئی اور چیز، اگر اہل سنت خلفاء کی موجودہ ترتیب کو درست و صحیح مانتے ہیں تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ حضرت علی کے غیر معمولی فضائل اور ان کی وصایت سے منکر ہوں اور اگر حضرت اہل شیعہ خلافت کا اولین مستحق حضرت علی کو قرار دیتے ہیں تو اس سے لازم نہیں آتا کہ وہ دیگر صحابہ کو کافر و منافق قرار دیں۔

اگر سنی، اسلام کی ضروری شرط یہ قرار دیتے ہیں کہ اعتراف توحید و رسالت کے ساتھ ہی ساتھ ترتیب خلافت کا بھی اقرار ضروری ہو تو میرے نزدیک وہ بھی اسلام سے ہٹے ہوئے ہیں اور اگر شیعہ وصایت



جناب امیرؑ، اور مصوبیت امام کی تصدیق جزو مذہب سمجھتے ہیں تو وہ بھی  
ناسلم ہیں۔

اس تمام گفتگو کے بعد حسب ذیل نتائج اخذ کئے جاسکتے ہیں۔  
۱۔ جس حد تک روایات کا تعلق ہے اخلاق و فضائل کے لحاظ سے  
حضرت علی کا مرتبہ بہت بلند نظر آتا ہے اور رسول اللہ کی روحانی خلافت  
کے لئے آج سے زیادہ موزون کوئی اور نہ تھا لیکن چونکہ رسول اللہ کے بعد بلا  
خود مختارانہ طور پر سیاسی خدمات انجام دینے کا موقع انھیں نہیں ملا، اس لئے  
اس امر کا فیصلہ کہ رسول اللہ کے بعد سیاسی جانشین ہونے کی حیثیت سے بھی  
آپ مزج حق رکھتے تھے اب ممکن نہیں۔

۲۔ رسول اللہ یقیناً اپنے بعد حضرت علی کی خلافت کے متمنی تھے اور اپنے  
اپنے اس خیال کا اظہار بھی کیا لیکن آپ کی اس خواہش کا تعلق وحی یا فرمان  
خداوندی سے نہ تھا بلکہ صرف آپ کی ذاتی رائے سے تھا اور اس کا مفہوم  
یہ تھا کہ اگر حضرت علی کی خلافت کا امکان ہو یا ان کی خلافت کا مسئلہ بحث  
میں آئے تو آپ کی رائے ان کے حق میں شمار کی جائے۔

۳۔ رسول اللہ کی وفات کے بعد حالات حضرت علی کی خلافت کے مساعد  
نہ تھے اور اگر آپ خلافت کے دعویدار ہوتے تو کامیاب نہ ہوتے۔ اس حقیقت

سے رسول اللہ بھی واقف تھے اور اسی لئے آپ نے باضابطہ طور پر کھلم کھلا اپنی وفات کے وقت حضرت علی کے ہاتھ پر لوگوں کی بیعت نہیں لی۔ اور خود حضرت علی بھی جانتے تھے جس کا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے بھی نہایت خاموشی سے جمہور کے فیصلہ کو تسلیم کر لیا اور کوئی مخالفانہ اقدام نہیں کیا۔

۴۔ اسلام کا مدعا جو کہ ملکیت و تقدیم شخصی کو مٹا کر جمہوریت کی روح پیدا کرنا تھا اس لئے رسول اللہ یون بھی اپنے بعد کسی کو قطعی طور پر خلیفہ نامزد نہیں کر سکتے تھے۔ جبہ جائیکہ اپنے خاندان میں ہمیشہ کے لئے خلافت و امامت کو منحصر کر دینا کہ یہ کھلی ہوئی ملکیت کی طرف داری تھی۔ اگر رسول اللہ ایسا کرتے تو ان میں اور دنیاوی فرمانروانوں میں کوئی فرق نہ رہتا اور دنیا ہی کہتی کہ نبوت و رسالت کا یہ سارا ڈھونگ اسی لئے تھا کہ اپنے خاندان کے لئے سلطنت کی بنیاد قائم کر جائیں۔

۵۔ چونکہ رسول اللہ عالم الغیب نہ تھے اور مستقبل کا علم آپ کو حاصل نہیں تھا اس لئے آپ کو کیا معلوم ہو سکتا تھا کہ اہلبیت میں کون کس اہلیت کا پیدا ہو گا اور وہ حق امامت و خلافت ہو گا یا نہیں اور اگر یہ کہا جائے کہ آل رسول کا اصل و کمال نشان ہونا حقانیت ثابتہ میں سے ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اس وقت بھی تمام سادات کو انھیں سفاکتی متصف ہونا چاہیئے، حالانکہ یہ بالکل خلاف واقع ہے۔

۷۔ چونکہ رسول اللہ سے (باد جوڈ معصوم ہونے کے) امور غیر الہامی میں اجتہادی غلطی کا امکان تھا اس لئے ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ کا انتخاب حالات بالبعد کے لحاظ سے مناسب نہ رہا ہو یا اگر مناسب بھی رہا ہو تو خلفاء نے اس کے سمجھنے میں غلطی کی ہو۔ اور یہ غلطی ایسی نہیں جس کا تعلق مذہب سے ہو۔ حضرت علی کے متعلق عقیدہ رکھنا کہ آپ کی امامت "نصر قطعی" سے ثابت ہے، کسی طرح درست نہیں ہو سکتا کیونکہ کلام مجید اس باب میں بالکل ساکت ہے اور "نصر قطعی" نام ہے صرف قرآن پاک کا۔ احادیث سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

۸۔ شیعہ جماعت اول اول صرف ایک سیاسی جماعت تھی جس کی مدعا خلافت کو اپنے ذاتی مصالح یا خواہش نبوی کی بنا پر اہلبیت میں منتقل کرنا تھا اور امام حسین کی شہادت تک اس کی حیثیت صرف ایک ادارہ سیاسی کی سی رہی لیکن واقعہ شہادت کے بعد اس جماعت نے اپنے سیاسیات کو مذہبی رنگ دینے کے لئے بعض مخصوص عقائد متعین کر لئے جن کو تعلیمات مذہب اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔

۹۔ جمعیت اسلامیہ میں سب سے پہلے انتشار مذہب شیعہ نے پیدا کیا۔ اور پھر اس میں بھی باہم گراستے اختلافات پیدا ہو گئے کہ وہ اپنا کوئی متحدہ سیاسی محاذ بھی نہ قائم کر سکا۔

۱۰۔ اہل تشن کو تسلیم کرنا چاہیے کہ رسول اللہ شریک حضرت علی کی خلافت کے متمنی تھے اور اہل تشیع کو ماننا چاہیے کہ رسول اللہ کی یہ خواہش بعض ناگزیر حالات و اسباب کے ماتحت پوری نہ ہو سکی۔

## اور سب سے آخر میں یہ کہ

۱۱۔ امامت و خلافت کا مسئلہ کوئی مذہبی مسئلہ نہیں ہے اس لئے حقیقتاً شیعہ سنی کی تفریق بالکل بے معنی ہے اور ان دونوں کا اختلاف صرف تاریخ و سیاست کا اختلاف ہے جو ایک علمی اختلاف تحقیق سے آگے نہیں بڑھتا۔

نیاز فحوری





(۵)

# خلافتِ امامت

اس سلسلہ پر کھیلے پھینے کے نگارمین جو محاکمہ اشراج ہوا ہے اسے خلافت  
توقع سنی و شیعہ دونوں جماعتوں کے آزاد خیال افراد نے بہت پسند کیا۔  
لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی جانتا ہوں کہ متقشف حضرات ہنوز مطمئن نہ ہونگے  
اور نہ شاید کبھی ہو سکتے ہیں۔

میں نے جن نتائج کو اپنے مضمون میں پیش کیا ہے ان میں سے بعض  
جو حضرات شیعہ کے لئے قابل قبول ہیں اہل تسنن کے نزدیک غلط ہیں اور  
جوسنیوں کے موافق ہیں وہ شیعوں کے نقطہ نظر سے صحیح نہیں ہو سکتے اسلئے  
ضرورت ہے کہ اسی سلسلہ میں ان تمام مسائل کو بھی لے لیا جائے جو میرے  
مضمون کو پڑھنے کے بعد معرض بحث میں آ سکتے ہیں مثلاً۔

- ۱۔ عصمت و عفت کا مفہوم کیا ہے گناہ و خطا میں کوئی فرق ہے  
یا نہیں اور اگر لغزش و نسیان یا اجتہادی غلطی کا امکان انبیاء و ائمہ کو  
غیر معصوم بنانے کے لئے کافی ہے تو کیوں؟
- ۲۔ انبیاء و ائمہ اگر غلطی یا لغزش سے پاک تھے تو اس کے عقلی یا

نقلی دلائل کیا ہو سکتے ہیں ؟

۳۔ کیا انبیاء و ائمہ مستقبل کے حالات سے باخبر تھے، اگر تھے

تو اس کا کیا ثبوت ہے ؟

۴۔ قیام امامت کی ضرورت کیا ہے اور صرف اہلبیت میں اس سلسلہ

کا قائم رہنا کیوں ضروری ہے ؟

۵۔ وصایت جناب امیرائیت کرنے کے لئے حضرات شیعہ کیا نصوص

قطعیہ پیش کرتے ہیں ؟

۶۔ امامت کا بار ہو بین امام پر ختم ہو جانے کا کیا سبب ہو سکتا ہے ؟

۷۔ جو سلسلہ امامت دوسرے شیعہ فرقوں کے نزدیک صحیح ہے،

اس کو غلط قرار دینے کے لئے اثنا عشری جماعت کیا دلائل اپنے پاس

رکھتی ہے۔

۸۔ امام مستور یا مہدی موعود کے وجود و ظہور کی عقلی توجیہ

۹۔ ہر دو فریق کی روایات پر سیاسی ماحول کا کوئی اثر پڑا یا

نہیں۔ اگر پڑا تو کیا ؟

۱۰۔ مسئلہ خلافت کو اصل مذہب اسلام سے کیا تعلق ہے ؟

۱۱۔ اسلام نے ہدایت اجتماعی کا کیا اصول پیش کیا ہے اور اس کو

دیکھتے ہوئے نیابت و خلافت کا سلسلہ نامزدگی کے ذریعہ سے صحیح تسلیم کرنا

اور سی خاندان کے لئے مخصوص سمجھا اور سب سے بڑا سکتا ہے یا نہیں۔  
 چنانچہ میں ہر دو مذاہب کے علماء و اہل نظر کو دعوت دیتا ہوں کہ  
 وہ نہایت سنجیدگی سے ان تمام مسائل پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں  
 اور جہاں تک ممکن ہو ان روایات سے استدلال کریں جن کا تعلق صرف  
 خوش عقیدگی سے ہے اور درایتاً قابل قبول نہیں ہیں۔

میں اس بحث کے لئے زیادہ سے زیادہ اپریل سے دسمبر تک نو ہفتے  
 کی مہلت دے سکتا ہوں، اسکے بعد مجھے حق حاصل ہو گا کہ تمام شائع شدہ  
 مضامین کے مباحث و دلائل کو سامنے رکھا کر خود اپنی رائے پیش کروں۔  
 اور بالکل ممکن ہے کہ آئندہ جنوری کا پہلے صرف اسی موضوع کے لئے وقف ہو  
 اگر ناظرین نگار نے اس کو پسند کیا،

میں اس دوران میں ایک استفتاء بھی ہر دو مذاہب کے علماء سے کروں گا  
 اور جو جوابات مجھے موصول ہوں گے ان سے میں اپنے محاکمہ کے وقت کام لوں گا۔

میں نے

# فہرست مسئلہ خلا و اسما

اور

## محترم مدیر "نگار" کا محاکمہ

(ہر نام کے قلم سے)

ماہِ چہ ہی ماہِ چہ سال بھر اور اب جولائی تک چار مہینے اتنا عرصہ ہوا  
جب اس مسئلہ پر میرا سب سے پہلا مضمون شائع ہوا تھا۔

جو صاحب یہ خیال رکھتے ہوں کہ میں نے "نگار" میں مضمون اس توقع پر  
لکھا تھا کہ مدیر "نگار" میری رائے سے حوت بھرت موافقت ہی کر لیں گے  
وہ بالکل غلطی پر ہیں۔

میں کس طرح یقین دلاؤں کہ مجھے شیعہ و سنی کسی جماعت سے کوئی جانبداری  
تعلق نہیں ہے۔ اگر کسی جماعت کو میری آزادانہ تحقیق شیعہ مذہب کے موافق  
نظر آئی تو اس سے یہ سمجھ لینا کبھی صحیح نہیں تھا کہ میں شیعہ ہی ہوں۔

مجھے افسوس ہے کہ مسلمانوں میں "سطحیت" بہت زیادہ پیدا ہو گئی ہے  
اور ان کی نگاہ میں کسی مطلب کی گہرائی میں جانے سے انکار کرنے لگی ہیں۔



اسی کا نتیجہ ہے کہ سنیوں میں میرے مضمون پر شور برپا ہوا اور اخبار دن کی دنیا میں غلغلہ ہو گیا لیکن مدیر نگار کے محاکمہ پر "اطمینانی سکون" چھا گیا گویا وہ سمجھے کہ دگری بالکل ہمارے موافق ملی۔

اسکے برخلاف شیعہ جماعت اس وقت تک صبر و سکون کے ساتھ نتیجہ کا انتظار کرتی رہی جب تک کہ مسئلہ زیر بحث تھا لیکن ادھر مدیر نگار کا محاکمہ شائع ہوا اور شیعہ جماعت میں اضطراب پیدا ہو گیا۔ گویا تمام امید دن پر پانی پھر گیا کوئی مجھ غریب کو کہنے دیر ہا ہے کہ اس نے نگار میں اس شخص کو شائع ہی کیوں کیا۔ کوئی نگار کے محاکمہ کا سخت سے سخت اور مناظرانہ جواب دینے کو آمادہ ہے۔

مگر مجھے اس سب پر مست ہر کہ میں نے تحقیقاتی بحث کا ایک دروازہ کھول کر علمی دنیا میں ہل چل پیدا کر دی اور موجودہ صورت حال پر مبنی آتی ہے کہ یہ نتیجہ اٹا کیونکر ہو گیا۔

میرے خیال میں مدیر نگار نے جہاں تک میرے زاویہ بحث کا تعلق ہے فیصلہ بالکل میرے موافق کیا ہے اور اگر میرے مضمون سے شیعہ صحاب متفق تھے تو انھیں فیصلہ کے اس جزو سے بالکل مطمئن ہونا چاہیے تھا اور جہاں مدیر نگار کا فیصلہ مخالف نظر آتا ہے وہ ایسا جزو ہے کہ اس پر سنیوں کو بھی اسی حد تک برا فروخت ہونا چاہیے تھا جس حد تک شیعوں کو۔

میرے مضمون کی حیثیت وہ ہرگز نہیں ہو سکتی تھی جو کسی شیعہ عالم کے قلم سے  
 نکلے ہوئے مضمون کی جس میں مسئلہ امامت پر خالص عقاد کی حیثیت سے روشنی  
 ڈالی گئی ہو۔ اسی لئے میرے مضمون میں کلامی دلائل اور عقلی براہین کا پتہ بھی  
 نہیں ہے۔ میں نے تو صرف تاریخی حیثیت سے واقعات کی بنا پر یہ کھلایا  
 تھا کہ حضرت پیغمبر کا نشانہ یہی تھا کہ حضرت علیؑ ان کے خلیفہ اور جانشین ہوں۔  
 اس صورت میں میرے خلاف فیصلہ ہونے کی دو صورتیں تھیں۔ ایک  
 یہ کہ ان واقعات کو صحیح تسلیم کیا جاتا جن سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ دوسرے یہ کہ  
 ان واقعات کا نتیجہ وہ تسلیم نہ کیا جاتا جو میں نے قرار دیا ہے۔  
 میں دیکھتا ہوں کہ میرے جگہ کار کا فیصلہ ان دونوں جزوین میں میرے  
 بالکل موافق ہے۔

آنہوں نے میرے پیش کردہ تمام روایات تاریخی کو تسلیم کیا ہے صرف  
 ایک روایت واقعہ قرطاس کے متعلق شبہ کیا ہے کہ "اس کا تعلق اول تو وصی  
 جناب امیر سے ہے بھی نہیں کہیں کہ اب یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ رسول اللہ کا غز  
 و قلم منگو کر کیا لکھوانا چاہتے تھے" اور دوسرے یہ کہ تھوڑے اہل تسنن کے  
 نزدیک قابل لحاظ نہیں ہے، کیونکہ اس کے خاص راویوں میں ایک  
 یحییٰ بن سلیمان ہیں جو غیر ثقہ قرار دئے گئے ہیں، دوسرے راوی قبیسہ  
 ہیں جو بہت غلط سمجھے جاتے ہیں، تیسرے یونس بن زید ہیں جن کا حافظہ بھی

ضعیف تھا اور جو غلط گو بھی تھے، چوتھے راوی علی بن عبد اللہ بن حن کا  
 شمار ضعیف زمین ہے۔ رہ گئے ایک اور راوی حضرت ابن عباس سوان کا  
 اس وقت وہاں موجود ہونا ثابت نہیں۔

مجھے ہر حال میں نگار کی آزاد رائے کا احترام ہے لیکن اتنا کہنا ضروری  
 ہے کہ انھوں نے جو کچھ اس روایت میں شکوک ظاہر کئے ہیں وہ عام  
 اہلسنت کی جانب سے پیش نہیں ہو سکتے اس لئے کہ ان کے قواعد کی بناء پر  
 روایت کا صحیح بخاری کے اندر متعدد طریق سے ہونا ہی اس کی صحت و ثبات  
 کے لئے کافی ہے جس کے بعد راویوں کی جانچ پڑتال کا سوال ہی باقی نہیں رہتا  
 پھر اگر ہر ایک سند میں کوئی ایک راوی مجروح مان لیا جائے تو آخر میں چار  
 الگ الگ راویوں کے طریق سے روایت کا دار ہوتا بھی تو ایک قابل لحاظ  
 چیز ہے اور پھر جبکہ اس روایت میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کو غلط  
 طور سے بیان کرنے کی کوئی مخصوص غرض ہو سکے۔ جبکہ اس کے راویوں میں  
 کوئی ضعیف ہو۔ غیر ثقہ ہو۔ غلط گو ہو مگر "رفعی" کوئی ایک بھی نہیں ہے تاکہ  
 یہ سمجھا جاسکے کہ صرف حضرت عمرؓ پر رسول کی بارگاہ میں بے ادبی کا الزام  
 لگانے کے لئے یہ روایت ایجاد کی گئی ہے۔ رہ گیا یہ امر کہ رسولؐ آخر لکھنا کیا  
 چاہتے تھے؟ اسکو صراحت کے ساتھ تو میں بیشک نہیں دکھلا سکتا جبکہ وہ  
 لکھا ہی نہیں گیا۔ لیکن میں نے جس ترتیب کے ساتھ اس واقعہ کو اپنے مضمون میں

درج کیا ہے اس سے حقیقت کا انکشاف ضرور ہوتا ہے۔ پھر جبکہ یہ لکھا جاتا ہے کہ پیغمبر اپنی تقریر میں ”ومن كنت مولاة فعلى مولاة“ کہہ کر یہ فقرہ کہہ چکے تھے کہ: ”انی تارک فیکم الثقلین کتاب اللہ وعتدی اهل بیتی ما از، فتکتم بھالن تضلوا بعدی“۔

اور اسکے بعد روایات قائم مانگتے وقت آپ فرماتے ہیں: ”الکتب لکم کتابالن تضلوا بعدی“ اس سے ضرور پتہ چلتا ہے کہ تحریر یہی اسی کے متعلق ہونے والی تھی جس کے متعلق تقریر تھی۔ نیز حضرت عمر کا انکار کہ ”ہمارے لئے کتاب خدا کافی ہے، اور کوئی ضرورت نہیں“ جبکہ مدبر نگار اسکو تسلیم کرتے ہیں کہ رسول کا منشا یہی تھا کہ حضرت علی خلیفہ ہوں اور نیز یہ کہ دوسرے صحابہ کو منظور نہیں تھا اور یہ بھی کہ دوسرے صحابہ حضرت علی سے رشک رکھتے تھے۔

بہر حال اس روایت سے قطع نظر کرتے ہوئے دوسری تمام روایات کو مدبر نگار نے تسلیم کیا ہے اور آخر میں یہ فیصلہ بھی کر دیا ہے کہ: ”جس حد تک روایات کا تعلق ہر میرے نزدیک حضرات شیعہ اس عقائد میں بالکل حق بجانب ہیں کہ رسول اللہ کی دلی خواہش یہی تھی کہ حضرت علی آئیے بعد جانشین قرار دیئے جائیں“۔

بس۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ جہاں تک میرے مضمون کا تعلق تھا بحث بیان یہ



ختم ہو گئی۔ حضرت رسول کی دلی خواہش یہی تھی اور حضرت نے صحابہ کے لئے اس خواہش کو پورے طور پر ظاہر بھی کیا، یقیناً اور اگر ظاہر نہیں کیا تو ہم کو اور محترم مدیر نگار کو اس کی خبر کیونکر ہوئی؟  
اب یہ کہ آپ کی خواہش صحیح تھی یا غلط اور یہ کہ آپ کی خواہش کا پورا ہونا ممکن تھا یا نہیں؟

یہ سبچیں ہیں جو اب قائم کی گئی ہیں اور نیز یہ کہ اگر یہ خواہش پوری نہیں ہوئی تو کیا یہ کوئی مسئلہ ایسا اہم تھا جو تفریق مذاہب کا باعث ہو سکے؟  
یہ چیزیں میری بحث سے خارج ہیں اور یقیناً اب یہ اعتقادی چیزیں ہیں جن پر ایک غیر مسلم شخص کو بحث کرنے کا حق بھی نہیں ہے۔  
میں جہاں تک مجھنا ہوں مسلمانوں کا عقیدہ رسول کی نسبت یہ رہا کہ کہ آپ کا کوئی حکم اور کوئی امر حکم خدا کے خلاف نہیں ہوتا تھا اور یہ کہ آپ کی ہستی غلطی سے بالکل بلند ہے۔

اب اگر ”مدیر نگار“ اس مسئلہ میں اختلاف رکھتے ہیں تو یہ ویسے بہت سے مسائل میں داخل ہے جو عام مسلمانوں میں متفقہ حیثیت رکھتے ہیں لیکن مدیر نگار کو اپنی ”حریت رائے“ کی بنا پر ان سے اختلاف ہے جیسے بہشت و دوزخ، ملائکہ، معجزات انبیاء وغیرہ وغیرہ۔  
غالباً شیعہ صحاب کا بھی یہ خیال ہے کہ مسئلہ امامت اور نبوت کا جوئی

ساتھ ہے یعنی اگر نبوت میں وہی عبادی حیثیت مسلم رہی جس پر شیعوں کا عقیدہ ہے اور جو ایک حد تک دوسرے مسلمانوں میں بھی متفقہ ہے تو امامت کے مسئلہ کا شیعوں کے حسبِ لخواہ ملے ہونا ضروری ہے۔ بے شک اگر اصطلاحی نبوت ہی کے معنی میں تبدیلی ہو جائے اور عقیدہ رسالت ہی اُس شان پر باقی نہ رہے تو امامت بھی ختم ہے۔ اور شاید شیعوں کی جانب سے امامت کو "اصول دین" میں داخل کرنے کا بھی یہی منشا ہے یعنی وہ اس کو نبوت کا ایک جزو لانفک سمجھتے ہیں اور "ایمان بالنبی کے تحت میں اس کو ضروری خیال کرتے ہیں۔

بمگر مسئلہ امامت کا تعلق مذہب سے ہونا چاہیے یا نہیں؟ میرے ملے کرنے کا نہیں ہے لیکن جہاں تک نیری سمجھ میں آتا ہے جبکہ محترم مدیر کا حضرت پیغمبر کی دو حیثیتیں تسلیم کرتے ہیں ایک معلم مذہب ہونے کی اور دوسرے حاکم و منتظم ہونے کی تو اس مسئلہ کا تعلق مذہب سے ساتھ اسی وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک جانشینی کو صرف دوسرے جزو کے ساتھ مخصوص قرار دیا جائے جس کے بعد خلیفہ کی حیثیت سوائے بادشاہ کے کچھ نہیں ہو سکتی اور اس کے بعد ظاہر ہے کہ موجودہ زمانہ میں ہر فرمان روا جس سے انتظام ملک ہو جائے وہ خلیفہ رسول سمجھا جانا چاہیے یہاں تک کہ علی حضرت ملک مظم تاجدار و

اس وقت سب سے بڑے "خلیفۃ المسلمین" ہیں اس واسطے کہ عالم اسلامی کا زیادہ حصہ ان کے زیر سلطنت و حمایت ہر اور امن و امان سے زندگی بسر کر رہا ہے لیکن اگر خلافت کا تعلق پہلے جڑ سے بھی ہے جیسا کہ اب تک مسلمانوں کا خیال رہا ہے چنانچہ "خلافت" کی تعریف ہی یہ کی گئی ہے کہ: "النیابة عن النبی فی امور الدین والدنیا" تو اب مذہب کے ساتھ اس کا کھلا کھلا تعلق ہو جاتا ہے۔

اگر اس میں یہ مذہبی پیشوائی کی حیثیت قائم نہ رکھی جائے اور حضرات خلفاء کی حیثیت وہی رہ جائے جو اس وقت بادشاہ عراق یا ایران یا حجاز وغیرہ کی ہے تو پھر میں سمجھتا ہوں کہ شیعہ اور سنی کا اختلاف باقی نہیں رہ سکتا لیکن مشکل یہ ہے کہ حضرات اہلسنت اس کو گوارا نہیں کریں گے۔ وہ حضرات خلفاء کو مذہبی پیشوا بھی تسلیم کرانا چاہتے ہیں اور یہیں سے شیعہ سنی اختلاف کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔

یہ استدلال کہ "رسول اللہ کو وحی کے ذریعہ سے کوئی ہدایت اس باب میں نہیں کی گئی اور اگر اس کو واقعی کوئی مذہبی اہمیت حاصل ہوتی تو یقیناً وحی کے ذریعہ سے اس کا فیصلہ کیا جاتا" ممکن ہے کہ درست ہو مگر جہاں تک مجھے معلوم ہے شیعہ صحابہ وحی کی ہدایت کو اس باب میں قرآن مجید سے بہت شروء کے ساتھ تاجت کرتے ہیں اور علمائے اہلسنت ہی کے دھاریا

سے اس کی تفسیر بھی پیش کرتے ہیں۔  
 کاش اس مسئلہ پر اب کسی شیعہ عالم کی طرف سے بھی اظہار خیال کیا جاسکے  
 جسے میرے خیال میں مدیر نگار بخوشی شائع کریں گے تاکہ بحث کے تمام پہلو  
 سامنے آجائیں۔

مجھے بیشک صرف اپنی اتنی ہی ریسرچ کی بنا پر جسے میں نے اپنے  
 گزشتہ مضمون میں پیش کر دیا ہے اور جس پر مجھے خوشی ہے کہ محترم مدیر نگار نے  
 ہر تصدیق بھی ثبت کر دی ہے تھوڑا سا اختلاف محترم مدیر کے اس فیصلہ سے  
 ہے کہ رسول اللہ جاپتے ضرور تھے کہ جناب امیر خلیفہ قرار پائیں مگر آپ نے  
 اس کا اعلان نہیں کیا، اور اس کی ذمہ داری خود اپنے اوپر نہیں لی۔  
 جبکہ ہمارے سامنے ہے یہ واقعہ کہ بیعت عشرہ میں رسول نے اعلان کیا۔  
 ”فَاَیُّکُمْ یُؤْمِنُ بِیْ عَلِیٍّ هَذَا الْاَمْرُ عَلِیٌّ یُکُونُ اَخِیْ وَوَصِیِّیْ وَخَلِیْفَتِیْ  
 فَاَیُّکُمْ“ کون تم میں سے میرا ساتھ دیتا ہے اس شرط پر کہ وہی میرا بھائی میرا  
 ولی عہد اور میرا جانشین قرار پائے۔ ”علی آٹھے اور کہا کہ میں آمادہ ہوں  
 حضرت نے یہ شکر فرمایا کہ۔۔۔“ دیکھو یہ ہے میرا بھائی میرا ولی عہد جانشین  
 اب بتلائیے کہ اگر روح جہوریت اسی کی مقتضی تھی کہ رسول اس معاملہ کو  
 اپنے ذمہ نہ رکھیں اور عام مسلمانوں پر چھوڑ دیں تو آپ کو خواہ مخواہ یہ سبزلغ



دکھا کر اپنی نصرت کا وعدہ لینے کی کیا ضرورت تھی اور معاہدہ کرنے کا حق  
کو سنا تھا؟

اب سوائے اس کے کہ "بزمی صاحب" کی طرح اس کو صرف "وصلہ  
افزائی" پر مبنی قرار دیا جائے اور کیا چارہ کار ہے؟ مگر اس معاملہ میں مدینہ کا  
غیر اچھے ہیں کہ یہ ایک ایسا دعویٰ ہے جس پر نہ کوئی ثبوت پیش کیا جاسکتا  
ہے اور نہ جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کرنا اچھا معلوم ہوتا ہے۔  
یہ ابتدائے رسالت کا قصہ تھا اور انتہائے رسالت میں خطبہ حجۃ الوداع  
میں محمد بن حنفیہ نے کہا کہ "من كنت مولا فاعلى مولا" میں جس کا مولیٰ ہوں  
وہ میرا مولیٰ ہے۔ اور یہ بھی ارشاد فرمایا کہ میں اپنے بعد دو چیزیں  
چھوڑے جاتا ہوں ایک کتاب اسرار اور دوسرا میری عترت، میرے  
اہل بیت اور انھیں دونوں کی پیروی کرنا چاہیے۔

اب آپ ملاحظہ کیجئے کہ یہ اعلان نہیں تو اور کیا ہے یہ آخری تقریر  
ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنے بڑے مجمع میں کی۔ اس کے بعد آپ دو ہفتہ  
زیادہ زندہ نہیں رہے۔ اس کے بعد یہ کہنا کہ تک حق بجانب ہے کہ رسول  
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب آپ کے وصال کا وقت قریب آیا تو اس باب میں خاموشی اختیار  
کر لی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے بعد اور زیادہ قریب زمانہ میں بھی

رسول نے سکوت نہیں کیا۔ اُس وقت جب آپ مرض الموت میں مبتلا ہو چکے  
ہیں۔ جبکہ آپ کے وصال میں صرف چند روز باقی تھے اُس موقع پر بھی  
آپ نے تقریر کی اور فرمایا: "اے لوگو بہت قریب ہے وہ وقت کہ میں دنیا  
سے اٹھ جاؤں اور تم سے رخصت ہوں میں نے اس سے قبل تم سے سب کچھ  
کہہ دیا ہے اور حجت تمام کر دی ہے۔ پس تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں تمہارے  
درمیان خدا کی کتاب اور انبی عترت اہلبیت کو چھوڑے جاتا ہوں۔"  
یہ کہہ کر حضرت نے جناب میر کا ہاتھ پکڑا اور اسے بلند کر کے فرمایا:۔  
"علی قرآن کے ساتھ ہے اور قرآن علی کے ساتھ، یہ دونوں جدا نہ ہوں گے  
یہاں تک کہ میرے پاس حوض کوثر پہنچیں۔ میں ان سے دریافت کروں گا  
کہ تم نے ان سے میرے بعد کیا سلوک کیا۔ (صواعق محرقة مطبوعہ مصر صفحہ ۷۷)  
دیکھ جائیں یہ الفاظ کہ:۔ "قد قدمت الیکم القول معذرتاً  
الیکم۔" میں تم سے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا ہوں اور حجت تمام کر دی ہے۔"  
اس کے بعد پھر بھی کہا جاتا ہے کہ رسول نے اعلان کیا کہ نہ کر دیا بیشک  
اس کے بعد صرف ایک ہی چیز باقی تھی اور وہ تحریر۔ اُس کا رسول نے  
بند و بست کرنا چاہا جس کا صحیح بخاری میں واقعہ قرطاس کی صورت میں  
تذکرہ ہے۔

کہا جاتا ہے کہ کیا معلوم حضرت کیا لکھنے والے تھے؟ بے شک کیا معلوم

لیکن اگر لکھنے دیا گیا ہوتا آپ کو جو کچھ لکھنا چاہتے تھے تو کیوں کسی کو یہ  
لکھنے کا موقع ملتا کہ آپ خلافت ہی کے لئے لکھنا چاہتے تھے۔

حضرت رسول اکرم کے بار بار وہ الفاظ کہ میں تم میں دو کراۓ چیزیں  
چھوڑتا ہوں جن سے تم تک کی صورت میں تم گمراہ نہ ہو گے۔ اور پھر آپ کا  
یہ کہنا کہ "ایسا نوشتہ لکھو جس پر عمل کرنے سے تم گمراہ نہ ہو" اور حضرت  
عمر کا یہ فقرہ کہ "ہم کو بس کتاب خدا کافی ہے اور کسی بات کی ضرورت نہیں"  
کیا اس کے یہی معنی پیدا نہیں ہوتے کہ حضرت عمر کو انبی فرست کی بنا پر یہ یقین  
ہو گیا تھا کہ آپ وہی لکھنے والے ہیں جو آپ بہت دفعہ کہہ چکے ہیں جس میں آپ نے  
کتاب خدا کے ساتھ اپنی عسرت اور المیہ کو ضم کیا ہے اور ان دونوں  
کی پیروی کو ذریعہ نجات قرار دیا ہے اور اس کی بنا پر آپ نے یہ کہا کہ پہلے  
لئے تو بس کتاب خدا کافی ہے یعنی کسی دوسرے چیز کی ہم کو ضرورت نہیں ہے  
یقیناً ایک غیر متعلق اور بے غرض انسان مذکورہ صورت حال حضرت  
عمر کے اس فقرہ پر غور کرنے سے سوائے اس نتیجہ کے کچھ سمجھ ہی نہیں سکتا۔  
بے شک ائمہ قرطاس کے بعد فوراً رسول اللہ کا حال نہیں ہوا بلکہ پیش  
روح اس کے عالم میں اتنا وقت ملا کہ آپ اس کی تکمیل کر سکتے تھے لیکن حضرت  
عمر نے جن مدبرانہ الفاظ کے ساتھ اختلاف فرمایا تھا۔ دجن کا صحیح بخاری  
میں تذکرہ موجود ہے، ان کے بعد کوئی محل آپ کو انبی خواہش کے پورا کرنے کا

باقی نہ رہا تھا۔

وہ یہ کہ آپؐ نے فرمایا تھا کہ "رسول پر مرض کا غلبہ ہے جس سے آپؐ کے ہوش و حواس جا چکے ہیں"

بعض روایات میں یہ فقرہ ہے کہ "ان الرجل لیجور" "آپؐ نہ بیان کب رہے ہیں؟ آپؐ کے اس فقرہ کا حاضرین پر بھی یہ اثر پڑ گیا تھا کہ بعض لوگ کہتے تھے کہ رسولؐ جو کہتے ہیں ٹھیک ہے۔ قلم دوات حاضر کر دو اور بعض لوگ کہتے تھے کہ نہیں بات وہی ہے جو حضرت عمرؓ نے ارشاد کی یعنی واقعی رسولؐ کے ہوش و حواس درست نہیں رہے۔ اب آپؐ فرمائیے کہ اس کے بعد رسولؐ کو کب موقع تھا کہ کچھ تحریر کراتے اور اگر کچھ لکھواتے بھی تو وہ مستند کب سمجھا جاتا جب کہ خیال حضرات "بجالت صحت نفس و ثبات عقل" کی شرط ہی مفقود تھی۔

میں اپنے مسلمان اصحاب اور خصوصیت کے ساتھ سنی اصحاب سے گفت جاتا ہوں۔ میں تو تاریخی واقعات سے دیکھ رہا ہوں کہ غدیر خم کے واقعہ کے بعد ایک مکمل سازش ہو گئی تھی کہ رسولؐ کا مقصد کامیاب نہ ہونے یا جائے اور اس سازش کے ارکان اتنے اندر دنی تھے کہ رسولؐ اپنے بستر بیماری پر بھی ان کے درمیان گھرے ہوئے تھے۔ اور خود حضرت کو بھی اس سازش کا پورا اندازہ ہو گیا تھا۔ اسی سازش کے ٹوڑنے کے لئے آپؐ



شکر اسامہ کے بھیجنے کا بندوبست کیا تھا اور نام بنام تمام مضر عناصر سے  
چاہا تھا کہ فضا کو صاف کر دین اور اس کے لئے اتنے تاکید و احکام نافذ کئے  
تھے کہ "خدا کی لعنت ہے اس پر جو شکر اسامہ میں نہ جائے" مگر آپ کی  
عدول حکمت کی گئی جس کے بعد آپ کا کوئی اختیار نہیں تھا۔

محترم مدیر نگار نے اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ بیشتر صحابہ کو حضرت  
علی سے رشک و رقابت اور عداوت تھی اور مختلف وجوہ کی بنا پر آپ کے  
خلاف متفق تھے۔

اس صورت حال میں وہ فرماتے ہیں کہ علی کا خلیفہ قرار پانا غیر ممکن  
تھا، بے شک غیر ممکن تھا، لیکن اس سے تمام اصحاب الزام سے بری  
تو نہیں ہو جاتے۔

فرض کیا جائے کہ ایک بادشاہ، رئیس، امیر کبیر کے تمام ملازمین  
اس کے فرزند کے قتل کرنے پر متفق ہو جائیں یقیناً اس کا قتل ہو جاتا  
اس صورت میں ناگزیر ہے لیکن کیا اس بنا پر قاتل بالکل بری قرار پائیں گے  
اس صورت میں کیا جماعت مسلمین، عقیدت مندان رسول کو آزادانہ  
طور پر واقعات کی جانچ کرنے کے بعد اس کا اقرار نہیں کرنا چاہیے تھا کہ  
جو کچھ ہوا وہ رسول کی مرضی کے خلاف ایک متفقہ بندوبست کا نتیجہ تھا  
جو قابل فہم ہے۔ نہ یہ کہ اس کے برخلاف "اصحابی" کلمہ عدل

”صحابہ کے سب اہل ہیں کے کلیئے بنائے جائیں اور غزوہ بدر، بیعت خیمہ  
وغیرہ کے پیغاموں کو بلا استثناء سب کے رشتہ کار، نیکو کار ہونے کی قطعی  
سند قرار دے لیا جائے اور“ اصحابی کا نجوم باجمہم اقتدیم لقتدیم  
کی سی روایتوں کو رسول کی زبانی بیان کر کے ہر ایک کی پیروی کو ذریعہ  
نجات سمجھ لیا جائے۔

محترم مدیر نگار کو یہ تسلیم ہے کہ ”خلفائے ثلاثہ کی خلافت کا مسئلہ  
رائے عامہ حاصل کرنے کے بعد طے نہیں کیا گیا، لیکن جن ذاتی اثرات  
کے ماتحت یہ حضرات خلیفہ تسلیم کئے گئے وہ غالباً ایسے تھے کہ اگر رائے عامہ  
حاصل کی جاتی تو بھی شاید نتیجہ یہی نکلتا۔“

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ ”ذاتی اثرات“ رسول کے منشاء کی نفقت  
میں کام نہیں آسکتے تھے اور جب ایسا نہیں ہوا تو مخالفت رسول کی  
ذمہ داری کیا اب انہی ”ذاتی اثرات“ والی ہستیوں پر عاید نہیں  
رہ جاتی؟ اور کیا اس صورت میں ان لوگوں سے اظہار اختلاف صرف  
رسول کے ساتھ بجا رہا یا بجا (عقیدت کا نتیجہ قرار نہیں پاتا لیکن ہم  
یہ دیکھتے ہیں کہ معاملہ بالکل برعکس ہو گیا یعنی حضرات اہلسنت و جہت  
کے تہاد و عہد ار میں گئے اور شیعہ جماعت کے متعلق یہ خیال قرار دیا گیا کہ  
ان کو رسول اللہ سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے۔“



پھر جبکہ پیبر نے اپنے انہی اظہارات میں انہیں محترم و بزرگوار بھی  
اعلان نہیں لیکن اظہار رائے کی حد تک صحیح سمجھتے ہیں اور یہ کہ ان کا  
نشانہ تھا کہ اگر انتخاب کی ذمت آئے تو رسول کا ووٹ علی کے حق میں  
سمجھا جائے (۱) اس مسئلہ کو کسی خالص دنیاوی پہلو کے اعتبار سے نہیں  
پیش کیا بلکہ اسے گمراہی سے بچنے کا وسیلہ اور نجات کا ذریعہ بتایا تھا  
جیسا کہ (لن تضلوا) کے الفاظ بتا رہے ہیں نیز یہ کہ "میں روز قیامت  
دریافت کروں گا کہ تم نے ان کے ساتھ کیا کیا؟"

تو اب بتائیے کہ اس چیز کو مذہب کے الگ اور اخروی جزا و سزا سے  
غیر متعلق کیونکر قرار دیا جائے۔

بہر حال جیسا کہ میں نے اپنے دوسرے مضمون میں تحریر کیا ہے  
اس وقت مسلمانوں کے لئے مسئلہ خلافت کا عملی پہلو صرف اس قدر ہے  
کہ وہ اپنے احکام و تعلیمات مذہبی میں کن پیشوا یا ان دین کو اپنا رہنما  
قرادین اور ان کے تعلیمات پر عمل کریں۔

اگر یہ مسئلہ اس وقت بھی طے پا جائے اور تمام اہل اسلام متفقہ حیثیت  
سے عزت رسول کی مذہبی پیشوائی کو قبول کر لیں اور احکام و تعلیمات  
مذہبی میں انہی کے تعلیمات کو مستند سمجھنے لگیں تو پھر کوئی سوال ہی باقی  
نہیں رہتا۔ اس لئے کہ خلافت بمعنی بادشاہت تو ایک وقتی عہد ہے



جس کے احکام انتظامی حیثیت رکھتے ہیں جن کا کوئی تعلق آئندہ نسلوں کے ساتھ ہو ہی نہیں سکتا۔ اسلئے اگر حضرات خلفاء کی حکومت کو اس حیثیت سے اُن کے زمانہ میں تسلیم بھی کیا جائے تو موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے ساتھ اُس کا کوئی عملی یا اعتقادی تعلق ثابت نہیں ہوتا اور اس لئے موجودہ زمانہ میں شیعہ اور سنی تفریق کا کوئی سبب باقی نہیں رہتا۔ خدا کرے مدیر نگار کی کوشش کامیاب ہو اور مسلمانوں کی تباہی تفریق دور ہو کر ایک مذہب قرار پائے جس کو کہا جاسکے ”حقیقی اہلام“۔

بس مجھے اب اس سلسلہ میں کچھ کہنا نہیں ہے۔ مدیر نگار نے جو تیقحات قائم کئے ہیں اُن پر اہلسنت اور شیعہ مذہب کے علماء کو بحث کرنا چاہیے اس لئے کہ زاویہ بحث اب ایسے نقطہ پر پہنچ گیا ہے جو ایک ”ہندو“ کے دسترس سے باہر ہے۔

”ہر نام“



(نگار) گزشتہ فروری کے نگار میں مسئلہ خلافت و امامت پر میرے محاکمہ کی اشاعت کے بعد اس وقت تک متعدد مضامین شیعہ دینی حضرات کے موصول ہوئے لیکن اُن کو شایع نہیں کیا گیا کیونکہ جو طریق ہتدلال ان میں اختیار کیا گیا ہے وہ یا تو بکسر محاذ لانہ ہے یا پھر اُس انداز کا جو



اس سے قبل بارہا استعمال ہو چکا ہے اور ناکام ثابت ہوا ہے۔  
 جس حد تک روایات کا تعلق ہے یقیناً حضرات شیعہ اس اعتقاد میں  
 بالکل حق بجانب ہیں کہ رسول اللہ جناب امیر کی خلافت چاہتے تھے  
 اور اپنی اس خواہش کا آگے اظہار بھی فرمادیا تھا۔ اہل سنت و کبر  
 خلفاء کے صرف فضائل بیان کر کے اس حقیقت کے ثمانے میں کبھی  
 کامیاب نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ سوال خلافت کا ہے نہ کہ محض فضیلت کا  
 اسی کے ساتھ المہنت کا مناظرانہ پہلو اسلئے اور بھی زیادہ کمزور ہوتا ہے کہ  
 جو کچھ وہ کہتے ہیں اسے شیعہ روایات سے ثابت نہیں کر سکتے اور شیعی حضرت  
 خود المہنت کی روایات سے حضرت علی کی وصایت و خلافت کو ثابت کر دیتے  
 ہیں۔ اسلئے اب اس مسئلہ پر بحث کرنا کہ رسول اللہ حضرت علی کو اپنا جانشین  
 و خلیفہ بنانا چاہتے تھے یا نہیں، بیکار ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ  
 اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے بعد (نفس مسئلہ امامت پر گفتگو کیا  
 یعنی یہ کہ اسکی اہمیت ذریعہ اسلام میں کیا ہے اور اسی کے ساتھ یہ کہ  
 کیا جناب امیر کی امامت واقعی منصوص علی یا نہیں۔  
 اسی لئے میں نے ماہ مارچ شمار کے نگار میں چند مباحث متعین کر دیے  
 تھے۔ اور چاہتا تھا کہ شیعہ علماء اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں،  
 لیکن افسوس ہے کہ اس وقت تک کسی نے توجہ نہیں کی۔

اب جناب ہر نام کا (جو اس تحریر کے بانی ہیں) یہ دوسرا مقالہ شلیہ  
 کیا جا رہا ہے، وہ بھی میرا محاکمہ دیکھنے کے بعد اب اس ضرورت کو  
 محسوس کرتے ہیں۔ چنانچہ میں پہلے شیعی علماء سے درخواست کروں گا کہ وہ  
 تمام ان مباحث کو سامنے رکھ کر جواب دہی کے لئے نگار میں درج  
 کئے گئے ہیں، اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں اور اس کے بعد شیعی علماء کو  
 متوجہ کروں گا کہ وہ جواب دین سکین دونوں فریق سے میری التجا ہو  
 کہ جو کچھ دیکھیں اس میں کوئی مجادلانہ پہلو نہ ہونا چاہیے، نیز یہ کہ  
 روایتی استدلال میں وہ صرف فریق مخالف کی کتابوں کو سامنے  
 رکھیں، در نہ یوں تو اپنی اپنی روایات کو سامنے رکھ کر ہمیشہ بھی  
 بحث کی ہے اور اسی لئے معقول نتیجہ کبھی پیدا نہیں ہوا۔

—————  
 —————

(تمام مشہد حیدرآباد)